ادبی، اخلاقی، سیاسی مضامین کا مجموعہ

آئینۂ دِل

از

سیّد قسیم الدین فیروزوی

ملنے کا پتہ

سیّد قسیم الدین نیو مارکیٹ سلہٹ

مشرقی پاکستان

ادبی، اخلاقی، سیاسی مضامین کا مجموعہ

آئینۂ دل

از

سیّد قیم الدین فیروزوی

ملنے کا پتہ
مکتبہ اشاعت اردو
الف - ۲۷ [illegible] کالونی - [illegible]
~~سیّد قیم الدین فیروزوی نیو مارکیٹ سلہٹ (مشرقی پاکستان)~~

دار التالیفات - خداداد کالونی - کراچی ۵

نام کتاب ——— آئینۂ دل

مصنف ——— سید قسیم الدین فیروزی

کتابت ——— ۶۔ دار الکتابت۔ کراچی

طباعت ——— ایجوکیشن پریس۔ کراچی

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت:-

۱۵ روپے

فہرست مضامین

عرضِ حال

راقم الحروف کوئی ادیب۔ دانشور یا صاحب علم ہونے کا مدعی نہیں۔ یہ مضامین میرے تجربات۔ تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔

بارہا مضمون کی تحریک خاص تاثرات کی بنا پر دماغ میں پیدا ہوئی کبھی مہینوں۔ برسوں اس پر غور کرتا رہا۔ مگر کاروباری مشغولیتوں کے باعث نہ فرصت ملی اور نہ ان کو صفحہ قرطاس پر آنے کی زحمت ہی اٹھانی پڑی سارے غور و خوض کے اثرات مرور ایام کی نذر ہو گئے۔

قارئین کے سامنے جو مضامین ہیں وہ بھی خاص واقعہ سے دماغ متاثر ہوا اس پر انتہائی سنجیدگی سے مہینوں خیالات کی دنیا میں منتشر مواد کو چُن چُن کر جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب قلم نے افکار کے ساتھ مناسبت پیدا ہونے کی کوشش بار آور ہوتے دیکھی۔ تو خود بخود تخلیقی طور پر خیالات الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہونے لگے۔

میں زبان دان ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ جو پڑھ رہے ہیں وہ میرے ذاتی فکر اور غور خوض کے طریقوں کی عکاسی کرتے ہیں یہ تمام خیالات میرے ہیں — میں نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ دنیا بڑی پرانی ہے۔ اس کے سارے موضوعات کسی نہ کسی ڈھب سے اس وسیع وعریض کائنات میں صاحب فکر کی قلمی جولانگاہ سے محفوظ رہنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اتنا ضرور ہے کہ اردو ادب میں شاید میری یہ کوشش اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادیت کہی جا سکتی ہے۔

وہی ادب زندہ حقیقت ہے جو ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ تصنع سے خالی ہو۔ کسی مقصد کے تحت لکھا گیا ہو اور خلوص پر مبنی ہو۔

"آئینہ دل" پہلی قسط ہے۔ اسی نوعیت کے بیشتر مضامین میرے کشکول میں محفوظ ہیں۔ اہل علم کی خدمت میں بطور نذر پیش کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

محمد قیم الدین

سلہٹ

۸ راگست ۱۹۷۱ء



سید قسیم الدین فیروزی

میلادِ رسول

مسلمانوں میں عام طور پر شکل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ظاہری صورت کی پرستش ہوتی ہے۔ فارم کی دیکھ ریکھ بڑی جاں سوزی سے کی جاتی ہے مگر روح جو اصل الاصول تھی وہ ناپید ہے۔ نمازی ہیں۔ حاجی ہیں۔ مولانا ہیں۔ پیر ہیں۔ درویش ہیں۔ سب کچھ ہیں مگر مسلمان نہیں۔ ماشاء اللہ۔

میں نے نمازیوں کو بہت ہی قریب سے دیکھا۔ زائرین حرمین شریفین کو بڑی محبت سے ڈھونڈھا۔ مولانا تو خاص طور پر میری تمناؤں کے مرکز رہے ہے۔ مگر گستاخی معاف میں نے بہت کم لوگوں کو اسلام کی روح سے واقف پایا۔ واقف نہیں بلکہ انہیں اس روح سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ قیامت تو یہ ہے کہ انہیں اسلام کے برحق ہونے کا دل سے یقین نہیں۔

ربیع الاول کا مبارک مہینہ ہے۔ سرورِ کائنات کی پیدائش کا مقدس دن ہے ذکرِ رسول ہر جگہ ہو رہا ہے۔ عوام تقریریں سن رہے ہیں۔ علماء کرام تقریریں فرما رہے ہیں۔ خوشیاں ہیں۔ چراغاں ہیں۔ سب بجا۔ مگر یہ کون کر رہے ہیں۔ وہ جو ننگِ اسلام ہیں رسول کے فرمان ان کی خواہش میں اگر ٹکراؤ ہوا۔ ان کی خواہش فائق رہے گی۔ خدا کے حکم اور ان کے جذبات میں اگر مڈبھیڑ ہوگی۔ ان کے جذبات کو اولیت حاصل ہوگی۔ مثال کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے دل سے پوچھ لے۔ جواب بھی مل جائے گا۔ کاش یہ نبی اُمی کی امت اپنے اعمال و افعال سے یہ ثابت کر سکتی کہ اس نے جس رسولِ امین پر ایمان لایا ہے وہ اس کے دلوں پر قابض ہے بلکہ اس کا دل تمام علائق سے بے نیاز ہے۔ اور اگر لگن ہے تو بس ذاتِ اطہر کی جس نے تاریکی دور کر کے انسانیت کو عمیق گہرائی سے

بچالیا. جس نے بیکسوں کی مدد اپنا شیوہ بنایا تھا۔ جس نے یتیموں کی مدد کو اپنا طرہ امتیاز سمجھا تھا جس نے خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو اصل ایمان قرار دیا تھا۔ جس کی بعثت کا خلاصہ ہی تھا کہ اخلاق کی تکمیل ہو۔

ایسا کیوں ہے۔ رسول کو ہم صدیوں بعد اس کی اصلی شکل میں نہ دیکھ سکا کیونکہ رسول کی زندگی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سیرت پر آئے دن جلسے ہوں۔ آپ کے حالات جس سے کیر کٹر بنے بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے جائیں۔

بیان کرنے والا صرف قوال نہ ہو فعال ہو۔ خدا کا خوف ہو۔ تاکہ بات کانوں سے گزر کر دلوں تک پہنچ سکے۔

زندگی

زندگی کیا ہے۔ یہ سوال ہر مفکر کے دماغ کو پریشان کرتا رہا ہے۔ اسی سوال نے کسی کو تخت سے نیچے اتارا ہے۔ کسی کو بے وطن کیا ہے۔ اور کوئی جنگل کی طرف افتاں وخیزاں بھاگتا نظر آیا ہے۔

فانی بدایونی نے ایک شعر میں گھبرا کر جو تاثرات کا اظہار کیا ہے شائد اس سے بہتر کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یوں تو خواب ہی کی حقیقت بہت کم معلوم ہے۔ پھر دیوانوں کا خواب یہ تو سراسر بے حقیقت ہے۔ ان اشاروں کے باوجود آخر زندگی کے لئے دنیا کیوں مدہوش ہے زندہ رہنا ہر ذی روح کا مقصدِ اولین ہے اس کے لئے قدرت نے اپنی کاریگری کی انتہا کر دی ہے۔ اس نے شکم مادر سے پیدائش تک جو جو جتن ہو سکتے ہیں۔ اس خاموشی اور سلیقہ سے مہیا کئے کہ انسان حیرت میں ڈوب جائے۔ بشرطیکہ وہ غور و فکر سے کام لے۔ انسان کی پیدائش اور اس کو محفوظ رکھنے کی مامتا یہ عورت نے ماں بننے پر سیکھی کہہ دینا آسان ہے مگر بلی کی پیدائش اور اس میں نر کو بلے کی زد سے محفوظ رکھنے کی وہ وجدانی قوت کس نے سکھائی اس کا جواب کون دے سکتا ہے۔ شیرنی جب شیر نر کو جنم دیتی ہے تو اس کو شیر کی درندگیت کا شکار ہونے سے کون سی طاقت ہے جو اسے چھپائے رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

آج کی سائنسی دنیا بھی اس رازِ فطرت کو سلجھانے کی قدرت نہیں رکھتی مولانا

آزاد نے فرمایا تھا کہ "مرنا آسان ہے چار کے کاندھوں پر ہنستے کھیلتے چلے جاؤ گے. مگر زندہ رہنا مشکل ہے اس کی قیمت دینی ہو گی" شاید اس سے زیادہ عمیق حقیقت زندگی کی کیفیت کو سمجھانے کے لئے نہ کہے گئے ہوں۔

زندگی کیا ہے. یہ سوال ہمیشہ مفکروں اور عقلمندوں کے لئے وبالِ جان رہا ہے مگر اس کی اصلیت کا علم تاریک سے تاریک تر ہوتا گیا۔ آج تک اس پر جو بھی لکھے گئے وہ روزِ اول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے. یوں تو زندہ چلتے پھرتے انسان ہم روزانہ دیکھتے ہیں. مگر ان میں بہت ہی کم ایسے ہیں جو حقیقت میں زندہ ہیں. کیونکہ زندہ رہنے کے جو اصول ہیں اس سے وہ نابلد ہیں۔ زندگی ایک مسلسل کشمکش ہے اس سے کسی کو نجات نہیں. کون ہے جو اس دنیا میں خوش ہے. بقول غالب ؎

قیدِ حیات بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس قنوطیت کا شکار غالب جیسا مردِ ظریف بھی ہو گیا۔ وہ غالب جو سولی پر چڑھتے وقت بھی اپنی ظرافت سے باز نہیں آیا۔

مگر میں غالب سے متفق نہیں ہوں. میں نے تو ہمیشہ زندگی کے خوشنما پہلوؤں کو دیکھا ہے میں فطرتاً پرامید واقع ہوا ہوں۔ اس تلاطم میں جو ہنسے وہ مرد ہے تھپیڑوں سے جو کھیلے وہ انسان ہے. طوفانوں سے گزر جانا ہی زندگی ہے. مبارک عظیم آبادی کا ایک شعر شاید زندہ رہنے کا بہانہ بن سکتا ہے ؎

دنیا کے غمکدے میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کر

بعض مرتبہ میں سوچتا ہوں کہ جب میں نہ تھا تو اس خدا کی سرزمین میں کوئی

کمی نہ تھی۔ جب میں نہ رہوں گا تو بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ پھر اس تھوڑی سی زندگی کا مقصد ہی کیا ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب زندگی کے اس پیمانے میں سوائے سوزش اور آہ و بکا کے دوسری چیز کا امکان محض عارضی ہے۔ یہ حقیقت مسلّم۔ اس میں استثناء معدوم۔

جب بنیاد یہ ٹھیری تو پھر اس جام زندگی کو آبِ شور سے کیوں لبریز کیا جائے۔ کیوں نہیں ان چھلکتے ہوئے قطرات سے عیش و سکون کے جام کو پُر کر کے دیکھا جائے۔ اس غم کو خوشی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ماضی کو بھلا دینا موجودہ کو خندہ پیشانی سے اظہارِ تشکر کے ساتھ قبول کرنا اور خدا سے امید خیر رکھنا یہ بھی تو زندگی کے پہلو ہو سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جام زندگی کو بھرنا اپنے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو خود بخود کبھی آبِ شور سے پُر نظر آتا ہے۔ کبھی آبِ شیریں اس میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ اپنے بس میں یہ دونوں ہیں تو ہمیشہ آبِ شیریں ہی سے لبریز رکھنا دانشمندانہ اقدام ہوگا۔

آبِ شور کون چاہتا ہے۔ ایسا سمجھنا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ ہم خوشی میں وقت کو بھول جاتے ہیں۔ ہمارے افعال ایسے سرزد ہونے لگتے ہیں جو ہماری عقل کو بودی کر کے رکھ دیتے ہیں اور ہم خود تلخی انجام سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

اسی زندگی کے موضوع پر میں اپنے محترم دوست جناب فطرت واسطی سے باتیں کر رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ زندگی کا ایک دور وہ ہوتا ہے جہاں مصائب و آلام کی وادیوں کا نام و نشان نہیں ملتا۔ وہاں نہ غالب کی قنوطیت ہوتی ہے نہ فانی کا خواب اور نہ مبارک کی میانہ روی۔ ہر چیز حسین نظر آتی ہے اور ہر طلوعِ صبح خوشیوں کی آماجگاہ ہوتی ہے۔ "وہ ہے جوانی"۔

لیکن حقیقت میں نگاہیں اس دور کو زندگی کب کہنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ تو نشہ سے مدہوشی کا دور ہے جہاں دیدار پرستی اور بے نشے کی مستی کے جادو کام کرتے ہیں۔

جب یہ عارضی دور ختم ہوتا ہے تو انسان زندگی کے متعلق سوچتا ہے یادِ ماضی فسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چشم زدن میں گزر جانے کا افسوس جب شروع ہوتا ہے وہیں سے زندگی کے صحیح خدوخال جاننے کا احساس اور اس سلسلے میں فکر و تعمق کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ خردمندانِ عالم نے یہیں سے زندگی کا آغاز کیا ہے اور جواہر پارے بکھیرے ہیں۔ تجربات کے ٹھوس ذرات اسی منزل پر آکر جمع ہونے لگتے ہیں۔ کھرے کھوٹے کی تمیز اور ہر رطب دیابس کو کسوٹی پر کسنے کی صلاحیت اسی نشے کے دور کے بعد ہونے لگتی ہے مختصر یہ ہے کہ زندگی ایک بوجھ ہے اس بوجھ کے ساتھ خوشیوں کے پھول بھی ہیں اور مصائب کے پہاڑ بھی۔ اسی آمیزش نے زندگی کو جینے کا سہارا دیا ہے۔ ہر خوشی میں اس کے چلے جانے کی کھٹک ہے اس لئے اس احساس سے خوشی کا دَور زیادہ پرکیف ہوجاتا ہے۔ اور ہر غم کے ساتھ اس کے ٹل جانے کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو زندہ رہنے کا ایک بہانہ ہے۔

مبارک کا مصرع پھر وردِ زبان ہے ؎

غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کر

اگر زندگی مسلسل خوشی ہوتی تو یہ بھی بوجھ ہی ہوتی اور اگر زندگی غم ہی کا نام ہوتا تو پھر اس کی طلب کون کرتا۔

یہ تو امید و بیم آس و نراس کے چکر ہیں جو زندگی کو سہارا دے رہے ہیں اور آگے بڑھا رہے ہیں۔ زندگی کی یہ ایک غیر فانی حالت ہے۔ مگر زندگی کیلئے یہ پہلو تاریک ہے۔

جب یاد ستاتی ھے

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

آج ۲۲ اگست ۱۹۷۰ء کو غوثی کی رخصتی میں نے کر دی۔ تمہاری دو بیٹیاں جن کو تم نے ایام طفلی میں ہی چھوڑ کر جام شہادت نوش کیا تھا۔ میں نے تمہارے چلے جانے کے بعد ان دونوں کی حسب استطاعت پرورش کیا اور پڑھایا لکھایا ان کی شادی کی انجام دہی کے بعد میں اپنے کو بہت ہی ہلکا محسوس کرتا ہوں

شائد تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے رخصت ہو جانے کے بعد کیا کیا انقلابات ان آنکھوں نے دیکھے۔ ملک کی تقسیم۔ گھر بار کو باچشم نم چھوڑنا، عزیز و اقربا سے جُدائی، سماجی زندگی جو زندگی کا اہم حصہ تھا۔ اس کا انتشار اور اسی کے ساتھ لاکھوں آفتیں جزو زندگی بن گئی ہیں۔

تم لوگوں نے اپنی جان عزیز حصول پاکستان کے لئے بھینٹ چڑھائی تاکہ اسلامی نظریۂ حیات پروان چڑھ سکے۔ کاش تم خود ہی کسی طرح دیکھ سکتے کہ ملک کی شکل کس طرح معرض وجود میں آئی۔ کیسے کیسے خواب، کیسی کیسی تمنائیں، کیسی آرزوئیں اور اُمنگیں بھٹکتی پھر رہی ہیں۔ ان کے تار و پود کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ پاکستان بنا تو سہی مگر دو حصوں میں اِن دو حصوں کی جدائی بُعد المشرقین ہے۔ اسلام کے نام پر سارے ہنگامے ہوئے۔ مگر اب علاقائی عصبیت نے اسکی جگہ لے لی ہے۔

اسلام اس ملک میں اجنبی ہے۔ بدیسی ہے۔ جن ماؤں کے گود خالی ہوگئے

وہ کرا رہی ہیں۔ جو لُٹے ان کو احساسِ زیاں باقی نہیں رہا۔ جو کچھ نہیں تھے، وہی سب کچھ ہیں۔ جو برباد ہوئے وہ مبہوت کھڑے گردِ راہ ہیں۔ روشنی کی امید میں کھڑے تھے، تاریکی میں گم کردہ راہ ہیں

ان تمام ناامیدیوں کے باوجود میرا یقین اپنی جگہ غیر متزلزل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری قربانیاں صرف اسلام کے نام پر ہوئیں۔ اور صداقت کا کا بول بالا رہا ہے۔

بہت دنوں سے میری یہ خواہش ہو رہی تھی کہ تم سے براہِ راست باتیں کروں۔ اِس طرف تم کئی بار خواب میں آئے مگر ایسی روا روی میں تھے کہ تم سے نہ کچھ کہہ سکا نہ اور نہ سمجھ سکا۔ تمہاری زندگی تو مجھ کو خواب ہی سی معلوم ہوتی ہے زندگی میں بھی تم برق رفتار تھے۔ اِدھر آئے اُدھر گئے۔ اور آج بھی جب تم آتے ہو یہی کیفیت ہے۔ میں تم کو آج بھی زندہ ہی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ شہید مرتے نہیں۔

کچھ دِن ہوتے جب ابا یہاں آئے تھے ایک دِن صبح چائے پینے کے بعد آبدیدہ ہو کر بولے کہ تینوں (تم۔ بھیا۔ جو بھائی) سے خواب میں ملاقات ہوئی۔ مجھ پر بھی رقت کا غلبہ ہو گیا۔ مگر میں تو زہر پینے کا عادی ہو گیا ہوں گھونٹ گیا۔ تاکہ ضعیف باپ پر میری کمزوریوں کا احساس نہ ہو سکے۔ پھر نہ وہ بولے اور نہ میں کچھ کہہ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ان کے خیالات کے رُخ کو پھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ زندگی کا اگر کوئی متاعِ گراں ہے تو تمہاری یاد ہے۔ اس کی حفاظت کرتا رہتا ہوں کہ یہ تار نہ کہیں ٹوٹ جائے۔

تم گئے رونقِ حیات گئی　　　غم گیا ساری کائنات گئی

میری کوئی خوشی نہیں جس میں تمہاری عدم موجودگی کا غم نہ ہو۔ غوثی کی شادی کی خوشی ہے مگر ہفتوں پہلے سے تم یاد آ رہے ہو۔ یہ کام تو تم کو انجام دینا تھا۔

مگر قسامِ ازل نے میرے لئے اس کو رکھ چھوڑا تھا۔

میں اس فرض کی انجام دہی سے ناراض نہیں ہوں۔ دکھ ہے تو اس بات کا کہ تم نہیں رہے۔ تمہاری ہر بات مجھے یاد آتی رہتی ہے۔ آخری بار جب تم مجھے پٹنہ جنکشن اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تھے تو تم نے کہا تھا "بھیا قصور معاف کر دیجئے"۔ تم نے کبھی رخصت کے وقت یہ جملہ نہیں کہا تھا۔ جب تمہاری شہادت کی خبر ملی تو یہ راز کھلا کہ تمہیں آنے والے واقعات کا علم پہلے ہو چکا تھا

اب میں بظاہر نہیں روتا ہوں بلکہ اندر ہی اندر تنور کی سی کیفیت لئے بیٹھا ہوں۔ روؤں بھی تو کس کے سامنے۔ سب بچے ہیں۔ اظہارِ غم بھی کروں تو کس سے درد آشنا کوئی نہیں ہے۔ کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ فرصت کے لمحات اور اور جذبات کاغذ پر انڈیل کر رکھ دوں۔ مگر اول تو فرصت ہی کہاں اور جب کبھی فرصت ملی تو الفاظ کی آمد ہی بند ہو جاتی ہے۔ قلم انجمادی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ الفاظ ڈھونڈیئے، نہیں ملتے۔ فوراً تھک جاتا ہوں۔ قلم غیر متحرک ہو جاتا ہے۔

۳ر نومبر ۱۹۴۶ء کا دن میری زندگی میں ایک سانحہ عظیم ہے۔ اسی دن تم شہید ہوئے۔ بہار میں وہ خونی ڈرامہ کھیلا گیا جس نے پاکستان جیسے مبہم نظریۂ فکر کو بالکل قریب کر دیا۔ عمارتوں کی بنیادیں گارے اور لوہے پر ہوتی ہیں۔ اس ملک کی بنیاد خونِ شہداء پر رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں طوفانی جھکڑوں کے باوجود اس نوزائیدہ ملک کی بنیاد ہلائی نہیں جا سکی۔ اغیار نے ہمیشہ غلط اندازے لگائے۔ کیونکہ انہیں بے لوث قربانیوں کی قدر و قیمت کا پتہ ہی نہیں ہے۔ ظالموں کو ان کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی فریادوں کا اثر کیا معلوم جس سے ابلیس تک لرز جاتا ہے

"پاکستان قائم رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے"۔ یہ الہامی الفاظ ہیں اسی طرح جس طرح "ہنوز دلی دور است" یہ ایک درویش کا جملہ تھا جس کے پیچھے حب للہ۔ تیاگ اور قربانیاں تھیں۔ پاکستان قائم رہنے کے لئے آیا ہے۔ اس کے پیچھے خلوص، بے گناہوں کے خون کی لالی اور تم جیسوں کی شہادت کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

تمہاری جدائی کے بعد خاندان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ والدین کے لئے زندگی کا بوجھ پہاڑ بن گیا۔ ان کی آنکھیں نم رہنے لگیں۔ مسکراہٹ مفقود ہو گئی۔ تمہاری لڑکیاں بے آسرا محسوس کرنے لگیں۔ تمہاری بیوی صبر وضبط کی پیکر مجسم ہو گئی۔ جوانی میں بڑھاپا آ گیا اور تعجب تو یہ ہے کہ آنکھوں کی روشنی غائب ہو گئی۔ خاندان کا سارا بوجھ مجھ پر آ گرا۔ میرے بس کا روگ نہیں تھا کہ میں ان ذمے داریوں کو کھینچتا مگر تمہاری قربانیوں کی برکت سے تاریکی کچھ دور چلنے کے بعد چھٹنے لگی۔ اب کشتی ایک کنارہ پر لگنے والی ہے۔ مگر میں تھک چکا ہوں ؎

ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

تمہارا دیا ہوا میرے پاس ایک آئینہ ہے۔ غالباً میں ۱۹۴۵ء میں مدھوبنی (ضلع دربھنگہ) جا رہا تھا۔ میرے پاس آئینہ نہیں تھا۔ تم نے اپنا استعمال کیا ہوا آئینہ دیدیا اور میں روانہ ہو گیا۔ یہ آج تک میرے پاس ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اکثر اس میں تمہاری صورت دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر تم کہاں؟ اس سے میں مایوس ہو چکا ہوں اس سے بہتر تو میرے دل کا آئینہ ہے جس میں تمہاری ہنستی ہوئی صورت ہمیشہ نظر آتی ہے۔ جب جب آئینے سے ناامیدی ہوئی بے خودی طاری ہو گئی۔ تفکر میں ڈوب گیا، تم صاف نظر آنے لگے۔ ٹھیراؤ ہوا، پھر ایک لاشعوری جنبش سے بنا بنایا گھروندا ٹوٹ گیا۔

یہی تو تمہاری زندگی تھی، اب یہی تعمیر و تخریب میری زندگی کا جزو لاینفک ہے آئینہ جسمانی طور پر بوسیدہ ہو چکا ہے۔ عرصہ بھی تو گزرا کم و بیش تیئیس سال آسیہ تمہاری چھوٹی بیٹی سے میں نے آئینہ کا تذکرہ کیا تو وہ حیران و ششدر رہ گئی کہ اتنی مدت تک آپ کیسے رکھ سکے۔ ۲۳ سال کی گزری ہوئی مدت کی گہرائیوں میں وہ کھو جاتی ہے۔ مگر میرے لئے یہ حادثہ ایسا ہے جیسے ابھی کل ہی کا تو واقعہ ہو۔ اب تعجب ہے تو یہ کہ اتنی طویل مدت آناً فاناً کیسے گزر گئی

یہ آئینہ جس میں تم اپنا عکس دیکھتے تھے میں بھی دیکھتا ہوں۔ اور جب دیکھتا ہوں تو تم یاد آتے ہو۔ پھر تخیل کی دنیا چند لمحوں تک ان یادوں کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ اور میں محو کیف ہوتے ہوتے چونک جاتا ہوں پھر تمہاری وہ جواں سالگی کی تصویر سامنے آتی ہے اور میں یہ سوچتا ہوں کہ تم بڑے پیارے ہو۔ میرے دل میں جو تصویر ہے وہ جوان ہے۔ اگر تم زندہ ہوتے گردش دوراں تمہاری صورت میں بھی اپنے چھپے ہوئے ہاتھوں سے انقلاب لانے میں کامیاب ہو جاتا جس سے مفر ممکن نہیں تھا۔ مگر اس کو یہ موقع نہ مل سکا البتہ یہ ضرور ہوا کہ تمہارے جانے کی وجہ سے بہت سے سوگوار قبل از وقت اپنی صورت کی شگفتگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ وہ جوانی ہی میں بوڑھے ہو گئے۔ اور اب میں اس شعر کو لطف لے کر پڑھتا ہوں ؎

تم گئے رونقِ حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

تمہارے جانے کے بعد جو کائنات رہ گئی وہ تمہارا غم ہے

جے پرکاش نرائن

پچاس کروڑ ہندوستان کی آبادی میں شاید ایک ہی مردِ میدان موجودہ دور میں کہلانے کا مستحق ہو۔ اور شاید اسی کو مردِ عزیمت یا مردِ مومن کا لقب آنے والے مورّخ دے بھی سکیں یہ ہے جے پرکاش نرائن۔

ہندوستان کی تقسیم ایک سانحہ سے کم نہیں مگر یہ مسلمانوں کا بنیادی مطالبہ نہ تھا۔ پانچ صوبوں میں اکثریت کے باوجود (پنجاب۔ سندھ۔ سرحد۔ بلوچستان۔ بنگال) مسلمانوں نے کبھی جدائی کا مطالبہ نہیں کیا۔ جیسے جیسے آزادی قریب سے قریب تر دکھائی دینے لگی۔ ہندوؤں کی ذہنیت کا پتہ چلتا گیا۔ زبان۔ کلچر اور سیاسی غلبہ کا جنون ان پر چڑھتا ہی گیا۔ اقلیت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو تحفظ کا ضرور خطرہ محسوس ہوا۔ اسی لئے انہوں نے کوششیں تیز کر دیں۔ کاش ہندوؤں کی جگہ کوئی دوسری قوم ہوتی تو پھر ہرگز یہ نقشہ نہ ہوتا۔

ملک کو تقسیم انگریزوں نے کر ہی دیا۔ اور بساطِ سیاست پر چونکہ وہ حاوی تھے اس لئے ایسی تقسیم کرائی گئی جس سے نمٹنا ہندوستان کے ان سیاسی مہروں کا کام نہ تھا جو کثرت آبادی کے غرور میں ایشیا کی قیادت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ بنگال کو کاٹ دیا گیا۔ پنجاب کی قوت توڑ دی گئی۔ کشمیر کو ایسا الجھایا گیا کہ سترہ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنی جگہ لاینحل معلوم ہوتا ہے۔

نہرو۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے خلاف اچھے ہنگامہ پرور تھے۔ مگر آزادی کے بعد ان کی قیادت نے اس برصغیر کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ پہلے تو یہ کہا گیا کہ حالات حسب معمول پر ہوں گے اس وقت رائے شماری کرائے جائے گی اور کشمیریوں

کو ان کا پیدائشی حق خود ارادی کا موقع دیا جائے گا۔ مگر وقت کے گزرنے سے انہوں نے اعلان کر دیا کہ اب یہ مسئلہ حل شدہ سمجھا جائے۔ مزید تفصیل مورخین کا فرض ہو گا۔ وہ اپنے خیالات کتابوں میں لکھتے رہیں گے۔ ساری قوم کو یہی سمجھایا گیا اور وہ اس کی صداقت پر کیسے شک کر سکتی تھی۔

اس عیاری اور مکاری کے دور میں ہندوستان ہی میں ایک شخص اٹھا جس نے پوری ایمانداری سے یہ اعلان کیا کہ مسئلہ کشمیر کا حل باقی ہے۔ بین الاقوامی وعدوں کا احترام کیا جائے۔ ہندوستان و پاکستان میں زیادہ سے زیادہ تعاون بڑھایا جائے۔ مسلم کشی بند کی جائے۔ مسلم کشی مردم کشی ہے۔ اس کا ارتکاب اور پھر اس کو چھپانا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس اعلان سے ہندو قوم بوکھلا سی گئی۔ قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں مگر صداقت ہمیشہ سربلند رہی ہے۔ اسی سربلندی کو لے کر جے پرکاش نرائن ۵ ستمبر کو پاکستان کے دورہ پر تشریف لائے ہیں۔ میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

ان حالات کی روشنی میں کیا یہ سوال حق بجانب ہو گا کہ ساری قوم بلکہ برصغیر ہند کی ہندو و مسلم آبادی پھر اپنے کردار کا جائزہ لے۔ ٹھیریئے۔ پھر سوچیں کہ کیا تقسیم سے واقعی کچھ فائدہ ہوا ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کا بنیادی مطالبہ تقسیم ہند نہ تھا۔ بلکہ ہندوستان کے اندر اپنے وطن اور اپنی جنم بھومی ہی میں ایک باعزت زندگی گزارنے کا حق انھیں ضرور ڈھونڈتا تھا۔ اسی نظریہ کے ماتحت انہوں نے ہمیشہ تحفظ ہی کا سوال اٹھایا۔ جداگانہ انتخابات ملازمتوں میں آسامیوں کی حفاظت گروپنگ سسٹم کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی زندگی اکثریت والی جماعت کے ساتھ پُرسکون طور پر بسر کر دینا یہی تھا معراجِ خیال۔ مگر تنگ نظری کا برا ہو۔ اکثریت نے ہمیشہ شک و شبہ دکھایا۔ اور آخیر میں وہ بھی مان لیا جو نہ ماننا تھا۔ یعنی تقسیمِ ملک۔

کانگریس کے بلند بانگ دعوے بڑے اچھے رہے ہیں۔ مگر قلبی کیفیت ہمیشہ

چنگیزی رہی ہے اور آج تک ہے۔ پاکستان میں سر جوڑ کر مسلمانوں کو بیٹھنا ہے دیکھنا یہ ہے کہ وہ پس ماندگان جو ہندوستان میں ۵-۶ کروڑ کے درمیان رہ گئے ہیں اُن کا کیا حشر ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ آئے دن کے مصائب قتل اور غیر اطمینانی زندگی بقول مسٹر Frank Anthony (ممبر لوک سبھا) کہ مسلمان موت کے سایہ میں رہ رہا ہے۔ نہایت ہی جانکاہ ہے۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر ہندوستان اور پاکستان نے اپنے مسائل حل نہ کئے تو سارے مسلمان وہاں سے یا تو پاکستان میں دھکیل دیئے جائیں گے (جو یہاں نہیں سما سکتے) یا عدم آباد میں بھیج دیئے جائیں گے جہاں سترہ سال سے وہ غیر مرئی طور پر بھیجے جا رہے ہیں۔

اِن دونوں حالات کے پیشِ نظر پاکستان کا نظریہ ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اتنی بڑی قربانی کے بعد اگر یہ چند گز زمین عارضی حصول عیش کے لئے مل بھی جائے تو یہ محض سراب کی سی کیفیت رکھتی ہے جو خود یہاں کے رہنے والوں کے لئے بھی چند سالوں میں تنگ ہو کر رہ جائے گی۔

ہندوستان اگر ذرا بھی تدبّر اور دور اندیشی سے کام لے تو فوراً قتل و غارت گری بند کرے۔ کیونکہ اس حربے کو آزما کر اس نے دیکھ لیا ہے اور پھر سارے مسلمانوں کے ساتھ اپنی پالیسی میں تبدیلی کر کے ان کو مخلصانہ طور پر جیتنے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں یہ دنیا کی تیسری عظیم ترین مسلم آبادی خود پاکستان کے لئے جو ہندوستانی مسلمانوں کے خون اور ہڈیوں کا رہینِ منت ہے بہت بڑا خطرہ ثابت ہو گی۔ اور اس کی جڑیں جو کمزور نظریات پر کھڑی ہیں خود بخود گر کر رہ جائیں گی۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ان بے بسوں کو جو ہندوستان میں چھوڑ دیئے گئے ہیں ہم نہ بھولیں۔ ہر وہ سمجھوتہ چاہے وہ کتنا ہی بھونڈا دکھائی دے اگر اس میں ان کی حفاظت کی جھلک ہو مان لیں گرچہ وقتی طور پر ہماری آرزوؤں کا وہ علمبردار نہ بھی ہو

آمدورفت کے طریقے میں آسانی پیدا کی جائے۔ تقسیم کی تلخیوں کو کم کیا جائے۔

اگر ایسا نہیں ہے تو پاکستان کا مقصد ہی فوت ہے۔ اور پھر ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہاں کے مسلمانوں کی مصیبت پر عورتوں کی طرح احتجاج کرتے پھریں۔

کاش جے پرکاش نرائن کے جذبات کی قدر کرنے والا اس اسلامی ملک میں بھی کوئی ہوتا۔

سلہٹ

۲۴ر اپریل ۱۹۷۰ء

بڑا آدمی

اکثر میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے۔ "آپ بڑے آدمی ہیں"۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو۔ مگر یہ اندازِ گفتگو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ جس کو بڑا سمجھا جاتا ہے واقعی وہ بڑا نہیں ہوتا بلکہ بڑاپے کا کوئی عنصر موجود نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ خوشامد کے طور پر کسی کو بڑا کہتے ہیں کوئی چند پیسوں کی بناء پر بڑا آدمی کہلاتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے کو بڑا تصوّر کرتے ہیں۔ اور اِس انا کو تسکین دینے کے لئے ایسا دکھاوا کرتے ہیں کہ دنیا والے اُن کو "بڑا آدمی" کہیں۔

سوال یہ ہے کہ بڑا کون ہے۔ بڑاپے کا راز کس میں مضمر ہے۔ بڑا کس کو سمجھنا چاہیئے آسان نسخہ جو میری سمجھ میں تجربوں کے بعد آیا ہے وہ یہ ہے کہ بڑا وہ ہے جو اپنے کو چھوٹا سمجھے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو چھوٹا سمجھے وہ بڑا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو واقعی ہر اندازِ فکر سے چھوٹے ہی کہے جا سکتے ہیں۔ وہ کسی پہلو سے بڑے نہیں ہو سکتے۔ سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا ؎

تواضع زگردن فرازاں نکوست

گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

اونچی گردن والے اگر خاکساری دکھائیں۔ اچھا معلوم ہوتا۔ بھکاری اگر گردن جھکاتا ہے تو اس کی یہ عادت ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ اونچی گردن والوں کا تعین کیا جانا چاہئے: گردن فرازاں ہونے کے لئے۔ دولت۔ دنیاوی جاہ و جلال۔ تمکنت۔ علم، عقل۔ سماج

میں خاص مقام ضروری ہیں۔

مذکورہ بالا اوصاف کا یکجا جمع ہونا نوادرات میں سے ہے۔ خصوصاً علم اور دولت علم بذاتِ خود مروجہ دولت سے زیادہ پائدار، برتر ہے۔ اس لئے اس کا شمار دولت میں کیا جانا غیر مناسب نہیں ہے۔ بڑے ہونے کے لئے میرے خیالِ ناقص میں علم کا شمار پہلے نمبر پر ہونا چاہیئے۔ اس میں مزید تفتیش کے بعد یہ بھی کہنا بے جانہ ہوگا کہ علم صرف وہ نہیں ہے جو دماغ کو کسی ڈگر کی طرف پھیر دے۔ بلکہ حقیقی علم وہ ہے جو عالم کی صحبت سے حاصل ہو۔ تجربہ سے سیکھا جائے۔ عقلمندوں کی مجلس میں بیٹھ کر حاصل کیا جائے۔ کائنات پر غور و خوض سے پتہ چلایا جائے۔ وہی علم ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھئے تو صاف نظر آئے گا کہ اولیت کتابی علم کو حاصل ہے یا تجربہ۔ مشاہدہ۔ صاحب کمال کی صحبت کو۔ کتابی علم کے پہلے انہی کو جگہ دینی چاہیئے۔ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ کتابی علم کو ثانوی درجہ حاصل ہونا چاہیئے۔ پہلے تجربہ ہوا۔ مشاہدوں سے کام لیا گیا۔ پھر ان کو محفوظ رکھنے کے لئے قلمبند کیا گیا۔ کتابوں کا رواج تو کاغذ کے صنعت کی دریافت کے بعد ہی حاصل ہوا ہوگا۔ مگر اس ایجاد سے پہلے بھی تو دنیا تھی۔ تہذیب تھی۔ تمدن کے آثار تھے۔ پتھروں کے بولتے مجسمے تھے۔ ان کی بنیاد صرف تجربوں پر ہی رہی ہوگی۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ پھر موضوع کی طرف لوٹیں۔ "بڑا آدمی کون ہے"؟

مذکورہ بالا سطور سے یہ واضح ہوگیا کہ علم بڑاپے کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری چیز جس کی بنا، پر کسی کو بڑا کہا جا سکتا ہے۔ وہ خیالات کی تبدیلی میں انقلابی صلاحیت کا موجود ہونا ہے۔ ارسطو بڑا تھا کیونکہ لوگوں کے سوچنے کے طریقوں میں اس نے تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سقراط بڑا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ نہیں

جاتا ہے۔ گاندھی بڑا تھا کیونکہ ہمیشہ اپنی غلطی کو بلا پس وپیش قبول کر لیتا تھا بڑا وہ ہوا جو اپنے کو چھوٹا سمجھے۔ بڑا وہ ہوا جس کو چھوٹے لوگ بڑا کہیں۔ آج دنیا میں جتنے بڑے ہیں وہ چھوٹوں ہی کے نعرۂ تکبیر کی بدولت ہیں۔ جب یہ نعرہ رکا۔ ان کا بڑا پا ختم ہوا۔

دنیاوی طور پر بڑا کبھی دوسروں کو بڑا نہیں سمجھتا جس دن اس کو یہ شبہ بھی ہو جائے کہ فلاں شخص مدمقابل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر وہ ممکن تدبیر اختیار کی جانے لگتی ہے جس سے اس کی شخصیت یا اہمیت یا شہرت کو دھکا پہنچے۔ شہرت بذاتِ خود دوسروں کی مرہونِ منت ہے۔ اس کا سہارا لینے والا یا اس پر ناز کرنے والا بڑا نہیں ہو سکتا۔

بڑے لوگ اس احساس سے بھی مبرّا ہوتے ہیں کہ وہ کچھ ہیں۔ بلکہ ان کو یہی احساس عظمت کی بلندی پر پہنچا دیتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہیں۔ اس میں تصنع کو کوئی دخل نہیں ہے بیساختہ پن ضروری ہے۔ اچھی تصویر وہ ہے جس میں بیساختہ پن ہو۔ ایسی تصویر کو قدرتی تصویر کہہ لیں۔ اصلی تصویر کہہ لیں یا یہ کہہ لیں کہ بالکل نیچرل ہے۔ انسان بھی ایک چلتی پھرتی تصویر ہے۔ اس میں جتنی سادگی۔ خالی از تصنع۔ بیساختگی ہوگی اتنی ہی اس میں محبوبیت کشش۔ مقناطیسیت۔ وارفتگی۔ خلوص کے عنصر موجود ہوں گے۔ انسانیت ہوگی۔ انسانیت کی کمزوریاں ہوں گی۔ کمزوریوں کا اقرار ہوگا۔ اقرار میں دلربائی ہوگی۔

کسی بڑے کی زندگی کا غور سے مطالعہ کریں تو یہ بات ضرور پائیں گے کہ اپنی کمزوری کا اقرار ہے۔

بڑا وہ ہے جو صحیح بات کو صحیح طور پر صحیح جگہ بیانگ دہل بیان کر دے۔ اس کو یہ خوف کبھی نہ ستائے کہ رائے عامہ خلاف ہو جائے گی۔ عوام کی تعریف یا توصیف کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ وہ رائے عامہ کے غلام ہوتے ہیں نہ وہ کسی کی تعریف سے مغرور نہ کسی کی مذمّت سے کبیدہ خاطر ہوتے ہیں۔

بڑاپے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ ان کو تفکر" نظر سے وابستگی ہو۔ دوسروں کے جذبات کی قدر ہو۔ اونچ نیچ کا خیال ہو۔ خاموش فطرت ہو۔ اصول کے لئے ہر بڑی سے بڑی قربانی پر ہمیشہ تیار ہو۔ سچائی کا پرستار ہو۔ خدمت خلق کے بے لوث جذبے کا حامل ہو۔ ایسا شخص یقیناً بڑا کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

پیغمبرِ اسلام کی وہ دعا:۔

"اے اللہ مجھے میری آنکھوں میں چھوٹا کر دے اور لوگوں کی
آنکھوں میں بڑا کر دے۔"

جب میں اس دعا پر غور کرتا ہوں تو وفورِ جذبات سے یا حقیقت پسندی کے بے پناہ اشاروں سے مغلوب ہو جاتا ہوں۔ دنیا میں بہت سی تمنائیں ہیں۔ تمناؤں کے حصول کیلئے دعائیں ہیں۔ یہ دعا اپنی خصوصیت کے اعتبار سے لاجواب ہے۔

بڑاپا کوئی خارجی خصوصیت نہیں ہے۔ جس کو دولت۔ حکومت۔ ظاہری شان وشو فوج کی طاقت۔ سامانِ جنگ کی کثرت جیسے زوال پذیر اسباب کے سہاروں پر قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ تو انسان کی اندرونی خوبی ہے جس سے شخصیت ابھرتی ہے یا گرتی ہے یہ اندرونی صلاحیت ہر انسان میں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے۔ اس سے کام لینا۔ اس کو صحیح طور پر نشو ونما کرنا ذاتی کمال ہے۔ جس کا نتیجہ بڑاپے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ہر ملنے والا دوست دشمن جب ایسی شخصیت سے دوچار ہوتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ے

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

بہت سے بڑے ایسے ہیں جو دور سے بڑے نظر آتے ہیں یا اپنے کو بڑے انسان کی طرح پیش کرتے ہیں۔ مگر ان کی قربت سے یہ طلسم ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایسے

لوگوں میں تصنع زیادہ ہوتا ہے۔ وہ عوام کے سامنے ایک خوبصورت غلاف میں آتے ہیں۔ وقتی طور پر اس غلاف سے لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں بڑاپے کا راز اس میں بھی پوشیدہ ہے کہ ان کی زندگی کھلی کتاب جیسی ہو۔ اندر باہر میں کوئی فرق نہ ہو۔ جو جتنا اندرونی طور پر قریب ہو۔ وہ زیادہ اس کی عظمت کا قائل ہو۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب زندگی کا ہر پہلو خلوص سے لبریز ہو۔

ونسٹن چرچل نے لارنس آف عربیہ کی زندگی کے متعلق کتنے پتہ کی بات کہدی ہے کہ اس کی زندگی میں جو قریب تر ہوا۔ اتنا ہی وہ مدح خواں بنا۔

رسول عربی کی زندگی عظمت کا سرچشمہ اسی لئے ہے کہ جو صاحب دل ہے۔ جتنا قریب ہوا۔ اسی قدر وہ گرویدہ ہوا۔ جن لوگوں نے آپ کو دور سے دیکھ کر غلط رائے قائم کر لیا تھا۔ وہی جب قریب ہوئے تو اقرار کرنے لگے کہ آپ میرے لئے محبوب ترین انسان ہیں۔

آپ نے ازواج مطہرات سے فرما دیا تھا کہ "جو تم رات کی تاریکی میں مجھ سے دیکھو وہ دن کی روشنی میں لوگوں تک پہنچا دو"۔

بڑے لوگ سادہ ہوتے ہیں۔ یہ ایک ضرب المثل ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ سادگی رہائش میں۔ گفتگو میں۔ خیالات میں۔ خیالات کے اظہار میں۔ بڑاپے کی شاندار پہچان ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو باہر بڑے تصور کئے جاتے ہیں۔ فرشتوں جیسی گفتگو درویشوں جیسی ظاہری شکل و صورت، وقتی طور پر متاثر کرنے کے لئے تیر بہدف کا کام کرتی ہے۔ مگر اس کا اعتبار اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام کی کسوٹی پوسر فرازی اسی پاک دامن کو ہے جس کو ہم جانتے ہیں۔ امامت کا مستحق وہ جانا ہوا فرد ہے جو ہم میں ہی رہتا ہے۔ لامعلوم جبہ و دستار کا علمبردار امامت میں اولیت حاصل

نہیں کر سکتا. کیونکہ اس کی زندگی ہم سے پوشیدہ ہے۔
نبیِ اُمیؐ کا فرمان کہ
"خیرکم خیرکم لاہلہ"
کس قدر دور رس ہے۔

ہر شخص کی بیوی اور گھر والے. شخص مذکور کی کمزوری اور بلندی کردار کو جانتے ہیں۔ اس لئے ان کا سرٹیفکیٹ۔ انسان کی شرافت. بلند اخلاقی اور اولوالعزمی کی زندہ دلیل ہے۔ یہ اچھے کو بُرا نہیں کہہ سکتے۔ برے کو اچھا نہیں بنا سکتے۔

میں یہ بھی مانتا ہوں کہ شاید ہی کوئی بیوی اپنے شوہر کی مداح ہوتی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سچے کو جھوٹا ہرگز نہیں کہہ سکتی۔ ایماندار شوہر کو وہ کبھی بے ایمان نہیں کہے گی۔ وہ اس کی شیطنت کو چھپا سکتی ہے سراہ نہیں سکتی۔ اس کی تلخ کلامی کا چرچا کر سکتی ہے. شیریں گفتاری کو دبا نہیں سکتی. گلاب کو جتنا بند کرو خوشبو اپنا راستہ نکال لے گی۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو یہ بھی ایک مذاق معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو بڑا سمجھا جائے اور کسی کو بڑاپے کے لفظ سے متصف نہ گردانا جائے. خدا نے انسان کو احسنِ تقویم کے بھاری بھر کم خطاب سے نوازا ہے. ہر شخص بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے احسن ہے اس میں تشخص. بخل. کوتاہ بینی کا کوئی دخل نہیں ہے. انسان من حیثیت انسان عظیم ہے۔

وجدانی طور پر انسان خود دار۔ راست باز۔ قانع. مصیبت میں اپنے کو بتقاضائے مواقع ڈھال سکتا ہے۔ آج تخت نشین ہے تو کل وہی تخت پر بیٹھنے والا مافوق الفطرت تاریک غار میں زندگی جیسی مقدس امانت کو ڈھوتا نظر آتا ہے. حالات اس کو ہوس. چاپلوسی۔ اپنے ہی جیسے انسان سے امید کا طالب بنا دیتے ہیں۔ سب سے

ذلیل انسان وہ ہے جو کسی انسان کے آگے دستِ سوال کنندہ نظر آئے۔ سب سے عظیم وہ شخص ہے جو اپنی ناک کو خدا کے حضور میں بصد عجز و نیاز رگڑتا دکھائی دے ؎

فروتنی است نشانِ رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

مناسبت

قدرت کی تخلیق بھی نرالی ہے کوئی دو صورتیں ایک جیسی نہیں ہیں کائنات کی کسی جنس کو لے لیجئے۔ بیّن فرق نظر آئے گا۔ دو انسان ایک جیسے نہیں دو بکریاں مختلف صورتوں کی نظر آئیں گی۔ دو پرندے ایک ہی جنس کے ایک دوسرے سے نمایاں فرق والے نظر آئیں گے۔ صورتوں کا فرق رنگ وروغن کا فرق یہ تو بہ ظاہر ہر مخلوق کا طرّۂ امتیاز ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مزاجوں میں بھی آسمان و زمین کا فرق ہے۔ یہی اختلافِ مزاج انسانوں کو انسان سے متنفر کراتا ہے اکثر سلجھی ہوئی گفتگو کا موقع اسی فرق نے نہ پیدا ہونے دیا۔ بنتی ہوئی بات اسی اختلاف کی چٹان پر پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ اسی اختلافِ مزاج نے امنِ عالم کو برباد کیا۔ اور اس کی اہمیت کا اندازہ جب جب غلط لگایا گیا تباہی و غارت گری ساتھ ساتھ آئی۔ اس لئے ہمیشہ ایسی صورت پیدا کی جائے تاکہ مختلف مزاج شخصیتیں عوام کی قسمت سے نہ کھیل سکیں۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ جب ہٹلر اور چیمبرلین کی گفتگو ہوئی مونخ پیکیٹ Munich Pact ہوا اور اس کا نتیجہ بھی ساری دنیا کو ابھی از بر یاد ہے۔ یہ ملاقات اِن دو شخصیتوں کی ہوئی جو کسی پہلو سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ کاش ہٹلر اور چرچل سے یہی ملاقات ہوتی تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

گاندھی جناح کی ملاقات۔ نہرو لیاقت ملاقات اور نہرو ایوب ملاقات کا اندازہ بھی اسی لفظ "مناسبت" سے لگایا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ لفظ "مناسبت" غیر محدود باریک جذبات کا حامل ہے۔ جس کو انتہائی غور و خوض

سے سمجھنا ہر عقلمند انسان کا فرض ہے کیونکہ اسی پر زندگی کی کامیابی کا راز وابستہ ہے۔ روزانہ کی زندگی میں ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ بعض انسان ہماری شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں چہ جائیکہ اس سے گفتگو کا موقع بھی مل سکے۔ بفرضِ محال اگر گفتگو ہو بھی گئی تو مقصد کی دوری اور شدید تر ہو جاتی ہے۔

بسا اوقات ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جہاں آنکھیں دوچار ہوئیں اور سارے معاملات اور ان کے عُقدہائے لاینحل تارِ عنکبوت کی طرح اُڑنے لگے۔ ناطق لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے ؎

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا
تمہاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا

پہلی چوٹ اگر دل پر بیٹھ گئی تو سارے مرحلے حل ہو جاتے ہیں جیسے کوئی دشواری تھی ہی نہیں اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ بغیر دیکھے انسانی دماغ دوسروں کے بارے میں ایک ذہنی خاکہ تیار کر لیتا ہے۔ اور اس خاکے کی بناء پر ایک نظریہ غلط یا صحیح موافق یا مخالف بنا لیتا ہے۔ اس نظریہ کا ٹکراؤ جب براہِ راست اس شخص مخصوص سے ہوتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔ اس لئے بغیر دیکھے سُنی سنائی باتوں پر کسی عمارت کی تعمیر دانشمندانہ فعل نہیں ہو سکتا۔

انسانی زندگی کی تعمیر و تخریب میں ہمیشہ یہ مناسبت ہی کام کرتی رہی ہے مناسبت کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ مِن کُل وجوہ تمام عادات و اخلاق میں ہم آہنگی ہو یہ تو قدرت کی تخلیق کے خلاف ہے۔ اس کی صناعی کوئی مشین کا چربہ نہیں کہ جو چیز مشین سے باہر ہوگی ایک ہی جیسی ہوگی۔ خدا کے مشین کی حیرت انگیز اور محیر العقول باریکی یہی ہے کہ ایک ہی ماں باپ کی دو اولاد صورتاً اور سیرتاً کسی طرح مناسبت نہیں رکھتے۔ آئے دن کے مشاہدات ہمیں خدا کے وجود پر قائل ہونے کے لئے مجبور

کر رہے ہیں۔ کیا عظیم صنعت کاری کی اس سے روشن مثال اور پیش کی جاسکتی ہے
انسان فطرتاً حسن پرست پیدا کیا گیا ہے مگر مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے
حسین سے حسین ترین صورتیں مکروہ نظر آتی ہیں۔ اُن کی قربت سے بُعد ہی بہتر
اُن کی جلوت سے تنہائی کو ترجیح۔ ایسا کیوں ہے۔ یہی "مناسبت" کی کمی اور اس
جادو بھرے لفظ کی اہمیت سے پہلو تہی۔ ہمیشہ ملنے جلنے اُٹھنے بیٹھنے میں اس
کا خیال ضروری ہے۔

اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دو ظاہری متضاد شخصیتیں مثلاً ایک دین دار دوسرا بے دین مناسبت کے اعتبار سے بہت ہی قریب ہے اور ان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو بغیر دوسرے کے چین نہیں۔ تنقیدی نگاہیں اس ملاپ کو برا کہتی ہیں مگر دل پر کس کا قبضہ ہے۔ یہ خدا ہی کی گرفت میں ہے۔ اسی کی جلوہ فرمائی کام کر رہی ہے اور انسان مجبور نظر آتا ہے۔ یہاں انسان کی بے بسی کتنی نمایاں ہو جاتی ہے اس کو اپنے دل پر بھی کوئی اختیار نہیں۔ ہر قدم پر "مناسبت" وجدانی طور پر کام کر رہی ہے اور تا قیامت اس کے اندر غیر فانی طاقت باقی رہے گی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ مناسبت حاصل بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ فرض کیا جائے کہ ایک کو دوسرے سے عادتاً یا مزاجاً سبت نہیں ہے ایسے دو شخصوں کا بدقسمتی سے اگر ایک ساتھ ٹکراؤ ہو جائے تو ان کا نباہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیا سوائے تلخی سے جدا ہو جانے کے اور کوئی دوسری صورت نہیں۔ اس کا جواب سعدی کا ایک شعر ہے ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطّف با دشمناں مدارا

باوجود مختلف مزاج ہونے کے زندگی کی بقا اسی میں ہے کہ وقتی طور پر

مناسبت پیدا کر لی جائے۔ کیونکہ بعض مرتبہ مختلف اور متضاد طبیعتوں سے ملنے اور ان سے کام لینے کا موقع ایسا آن پڑتا ہے کہ بغیر وہاں تک پہنچے ہوئے کام کا پورا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اس صورت میں Dale carnegic کے اصول بڑے مؤثر ثابت ہوں گے۔ سعدی کا وہ شعر جو میں ابھی لکھ چکا ہوں Dale carnegic کی پوری کتاب کا نچوڑ ہے۔

یہ مناسبت کا لفظ روحانیت کی دنیا میں ایک بحر ناپید کنار چھپائے بیٹھا ہے تلاش حق اور جستجوئے مرشد کی راہ نوردی میں دروازوں سے دھکے دے دے کر نکالے ہوئے محرومین قسمت کے لئے اس لفظ نے مرہم کا کام انجام دیا ہے۔ اسی لفظ نے تشنگان طریقت کو سکون بخشا ہے۔ درِ مرشد پر پہنچنے کے بعد جب انہیں یہ خبر ملی کہ تمہارے مزاج اور مرشد کے مزاج میں مناسبت نہیں ہے کہیں اور جاؤ یا فلاں کے پاس جاؤ۔ ان بے بسوں سے اس لفظ کی اہمیت کا اندازہ پوچھو۔

مشہور ہے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک صاحب بغرضِ بیعت حاضر ہوئے روٹی اور سالن بزرگ کے یہاں سے آتی رہی۔ تیسرے وقت اتفاق سے بزرگ اس طرف سے گزرے جہاں کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ سالن زیادہ کھالیا گیا ہے اور روٹی اس مقدار سے کم۔ اعتدال کی کمی کا مرض تجویز ہوا اور ان کو شرف بیعت سے محروم رکھا گیا۔

یہ کتنی معمولی اور بھلادی جانے والی بات تھی۔ مگر چشمِ بینا کے لئے۔ اس کے لئے جس نے زندگی کو اصول کے سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا ہو۔ جو ہر اس معمولی سے معمولی خلاف مزاج بات کو بھی اصول سے چمٹائے رکھتا ہو۔ بڑی دوررس اور نکتہ فہمی کی مثال ہے۔ یہ لوگ خدا والے تھے۔ ان کے تعلقات جسمانی یا بہ بنائے مصلحت نہیں تھے۔ بلکہ ان کے تعلقات بالکل قلبی اور دل سے متعلق تھے۔ وہاں کوئی ریا۔ یا مداہنت

کا سوال ہی نہ تھا۔ کیونکہ دِل کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ ایک رتی کے اونچ سے دِل کی دھڑکنوں میں ہزاروں حرکتوں کا الٹ پھیر ہو جاتا ہے۔ یہ خدا والوں کے لئے برداشت سے باہر ہے۔ ایسے ہی صاف دِل لوگوں نے تو پیغامِ حق پہنچایا ہے۔

لفظ "مناسبت" کی اہمیت کا اندازہ ان سے پوچھو۔

ازدواجی زندگی میں مناسبت کی بڑی اشد ضرورت ہے۔ دو نامعلوم شخص جذبات کی رو میں بے دھڑک غوطہ زنی کے بعد تھک کر ساحل کی تلاش میں غلطاں و پیچاں نظر آتے ہیں۔ طوفان تھم جانے کے بعد سکون کی جستجو ناگزیر ہے۔ مگر سکون تو تب ہی نصیب ہو سکتا ہے جب مزاج کی ہم آہنگی ہو۔

آئے دن سینکڑوں ہنستی ہوئی معصوم صورتیں اس مزاج کی غیر متوازن پہاڑیوں سے لڑھک کر خاک و خون میں ایسی ملوّث ہو جاتی ہیں جیسے ان پر کبھی بہار کے جھونکے آئے ہی نہ تھے۔

تھوڑی سی ناعاقبت اندیشی سے زندگی کے سنہرے خواب ہمیشہ کے لئے شرمندۂ تعبیر رہ جاتے ہیں۔ اگر بیوی خاموش ہے تو شوہر فضول گو۔ اگر شوہر کفایت شعار ہے تو بیوی فضول خرچ۔ کسی کو ادبی ذوق ہے تو دوسری جانب جہلِ مرکب۔ نتیجہ بالکل ظاہر ہے۔

میں نے تو دیکھا ہے کہ بیوی کے غلط اندازِ فکر سے فدائی شوہر بَد دِل رہتا ہے اور شوہر کی بلاوجہ پوچھ گچھ سے شریف و پاک دامن عورت دامن چھڑا کر الگ ہو جانا چاہتی ہے۔ کبھی پوتام نہ لگانے کی شکایت۔ کبھی کپڑوں کی ناپسندید خریداری پر ہنگامہ۔ یہ معمولی سی باتیں ہیں۔ ان کو بہت ہی جلد سمجھا جا سکتا ہے اور ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مگر اس میں مزاج شناسی اور مناسبت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے یہاں کی شادی جو کبھی کبھی ناکامیاب نظر آتی ہے اس کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سماج کا قصور ہے اور مرد و عورت کو بلا سوچے سمجھے ملا دیا جاتا ہے۔ مگر آج کی مہذب دنیا میں جو طلاق عام ہے وہ تو ایک دوسرے کو سمجھنے کے باوجود بھی ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی عیاں ہے۔ جذباتی خلط ملط صحیح نقطۂ حرارت نہیں بتا سکتے۔ جب اس کی طغیانی کم ہوتی ہے تو وہی عدم مناسبت کے ذرات سطح فضا پر سر اٹھائے نظر آتے ہیں جو کانٹوں کی طرح چبھنے شروع ہوتے ہیں۔ اس کی شدت کمزور اور تھکی ہوئی جانوں کو چین نہیں لینے دیتی۔ کاش مناسبت کے لفظ کو انسان سمجھ سکتا۔

اس مناسبت کی عظمت بچوں کی زندگی کے ساتھ سب سے زیادہ وابستہ ہے بچوں کا پڑھانا۔ ان کے ساتھ گفتگو۔ ان کی باتوں کا جواب، ان کے نہ ختم ہونے والے سوالات کے تابڑ توڑ سلسلے بیحد دلچسپ اور پیچیدہ ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ معصوم ہیں۔ مگر ان کی ذہانت۔ شرارت۔ بھولاپن۔ محیر العقول ہیں۔

عمر کے لحاظ سے ان کی نشو و نما تدریجی طور پر ضروری ہے۔ بچہ چاہے کتنا ہی ذہین اور پڑھا لکھا ہو۔ اس کی عمر کا تقاضہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہے۔ شیخ بو علی سینا اسلامی دنیا کا مشہور حکیم جس کی شہرۂ آفاق غیر فانی تصنیف آج بھی مشعل راہ ہے۔ اس کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ اندلس میں اپنی کمسنی کے ایام میں درس دے رہا تھا اور بہت سے تلامذہ جو سن و سال کے اعتبار سے اس سے بہت ہی بڑے تھے زیر تدریس تھے۔ شیخ پڑھانے میں مشغول تھا۔ دوران سبق اس نے دو کوؤں کو لڑتے دیکھا۔ وہ لڑتے لڑتے درخت سے گرے۔ شیخ اپنی مسند شیوخت کو بالائے طاق رکھ کر دوڑا اور کوؤں کو پکڑنے میں اپنی دستار فضیلت کی پرواہ کئے بغیر غلطاں و پیچاں تھا اس کے ہاتھ زخمی تھے اور سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ واپس آیا۔ شاگرد انگشت بدنداں تھے۔ شیخ کی اس حرکت پر ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد اس ننھے استاد نے بڑے ہی شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر جسے وہ ادھورا چھوڑ کر بھاگا تھا ایک زبردست تقریر کی ایک آمد تھی جو طوفان کی طرح اس کے دماغ میں امڈ رہا تھا۔ اور زبان کے ذریعے بہہ رہا تھا۔ ایک سے ایک باریکی۔ حیرت انگیز فصاحت و بلاغت کے ساتھ نوادرات کے بیش بہا جواہرات وہ بکھیرے جا رہا تھا۔ اب یہ شاگردوں کے لئے دوسری حیرت تھی۔ اس نے آخر میں کہا کہ میں اپنی عمر کے تقاضوں کو دبا نہ سکا۔ اگر کوّوں کی طرف میں نہیں بھاگتا۔ تو یہ جائز جذبات کی خوں ریزی ہوتی۔ میرے دماغ میں انقباضی کیفیت ہوتی۔ اور وہ تقریر جو میں نے کی ہرگز نہ کر سکتا۔ اس لئے جذبات کی صحیح طور پر پرورش ہونی چاہیئے۔

بچوں کی تعلیم بڑی مشکل ہے ان کے جذبات کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ بوڑھوں کو بچہ ہونا چاہیئے۔ تجربات کی آمیزش کے ساتھ معصومیت کا رنگ غالب ہو۔ شرارت کی قدر کی جائے۔ ان کی تعلیم دس برس کی عمر تک کتاب سے نہیں بلکہ خطابت کے ذریعے ہونی چاہیئے۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھ کر اسی جیسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

آج کی ترقی یافتہ قومیں بچوں کی جس طرح حفاظت کرتی ہیں۔ ان کی مناسبت کو غور کرتے ہوئے جو جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ وہ قابلِ صد رشک ہیں۔ ہم جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہمارے بچے جس کسمپرسی کے عالم میں برباد ہو رہے ہیں۔ اسے خدا کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ یہ قوم کی امانت۔ ملک و ملت کے لئے باعثِ نجات ہیں۔ اسی لئے تو حضرتِ عمر رضی عنہ نے ہر نومولود بچّہ کا وظیفہ مقرر کر کے اپنے اس قانون میں ترمیم کر دی تھی۔ جو ایامِ رضاعت کے بعد وظیفہ مقرر کرنے کا حکم آپ نے صادر فرمایا تھا اور اس پر عمل جاری تھا۔ اسلام تو باقی ہے مگر اسلامی حکومت کا اجرا عملی طور پر شاید اسلامی دنیا میں ناپید۔ مگر انگلینڈ۔ امریکہ اور دوسرے غیر اسلامی ممالک میں بڑے زور شور سے جاری و ساری ہے۔

کاش ہمارا دماغ اس اسلامی قانون سے مناسبت پیدا کرتا۔

متروکہ جائداد

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دو چار دنوں بعد شدید خوں ریزی اور سفاکی کے دوران ایک قافلہ امرت سر سے لاہور کی طرف بھاگنے کے لئے کسی طرح شہر چھوڑ دینے پر مجبور ہوا۔ ہر طرف بہیمیت تھی۔ روح فرسا نظارے تھے۔ چھپتے چھپاتے ایک خاندان دو عورتوں چند بچے۔ کچھ بوڑھے۔ کچھ نوجوانوں پر مشتمل قافلے میں شامل ہو گیا۔ ریل پر سوار ہونے کے بعد اس کی جان میں جان آئی۔

کچھ دور جانے کے بعد ریل رک گئی۔ پھر موت وحیات کی کش مکش۔ وہی آہ و بکا۔ لوٹ وقتل وخوں ریزی۔ جوان عورتوں کی بے حرمتی۔ راستے میں سکھوں نے شروع کر دی۔ مگر ان حالات سے بچ کر یہ خاندان پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ امرت سر سے کوچ کا فیصلہ بے بسی۔ بے زری۔ اس افراتفری میں ہوا کہ نہ پیسوں کا ہوش نہ کسی قیمتی جان سے عزیز خاندانی نوادرات کا خیال ہی آسکا۔ مفلوک الحال، بے یار و مددگار یہ اچھا کھاتا پیتا خاندان رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہوا۔ چلتے چلاتے گھر کی مالکہ چپ چاپ روزانہ کے اخراجات سے بچاتے ہوئے پیسوں کی ایک وزنی تھیلی جس میں سولہ سو نقدی چھوٹے سکے تھے۔ اُٹھانے میں کامیاب ہو گئی۔

کچھ دور بھاگ سکی مگر یہ بارِ گراں مصیبت بنی رہی۔ لڑکوں نے جب محسوس کیا کہ ماں چلنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے اور پیچھے رہ جانے کا خطرہ ہے۔ تب جا کر یہ راز کھلا کہ اصل حال کیا ہے۔ مگر اب اس بوجھ کی اہمیت بڑھ چکی تھی نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا گیا اور اب یہ بوجھ متاعِ خاندان بنا۔ لاہور پہنچنے کے بعد کیمپ کے قیام کے دوران سارے افرادِ خاندان کی توجہ کا مرکز۔ امیدوں کی دنیا حل مشکلات کا ورد، بچوں کے بہلانے کا سہارا یہ توڑا ثابت ہوا۔

کچھ دنوں بعد یہ اعلان ہوا کہ جن مہاجرین نے ہندوستان میں اگر کوئی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ چھوڑی ہے تو وہ حکومت کے دفتر میں لکھائے۔

دفتر کے سامنے اس اعلان کے بعد چھوڑی ہوئی جائیدادوں کی تفصیل لکھائی جانے لگی باری باری لٹے ہوئے قافلوں کے افراد آتے رہے اور لکھاتے رہے کہ ان میں ایک حسین وجمیل نوجوان۔ بلند پیشانی۔ گٹھے ہوئے بدن والا کاؤنٹر کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ کلرک نے سر سے پیر تک حیرت سے اس سجیلے، شرماتی ہوئی نگاہوں والے نوجوان کو دیکھا اور یوں گویا ہوا۔

کلرک۔ (نوجوان سے) آپ تو شکلاً نواب معلوم ہوتے ہیں۔ کپڑے بھی آپ کے اچھے نہیں ہیں تو برے بھی نہیں کہے جا سکتے۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ نصف ہندوستان اپنی متروکہ جائیداد میں لکھائیں گے۔ اور دعویٰ کریں گے۔

نوجوان۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ جو لکھیں گے وہ مل بھی جائے گا۔

کلرک۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ مگر حکومت پاکستان چاہتی ہے کہ متروکہ جائیدادوں کی فہرست تیار کر لی جائے۔

نوجوان۔ تو میں نہیں لکھاؤں گا۔

کلرک۔ کیا آپ ناخوش ہو گئے۔ میں نے نصف ہندوستان اس لئے کہا کہ معمولی شکل وصورت والوں نے مبالغہ آمیز طور پر جائیدادوں کی جو فہرستیں لکھائی ہیں وہ قابلِ یقین نہیں ہو سکتیں۔

نوجوان۔ آپ مبالغہ آمیز کیوں کہتے ہیں۔ شکل وصورت تو یقیناً لٹی ہوئی ہے نکالے ہوئے لوگ ہیں۔ تعجب کی کیا بات ہے۔ میں کچھ نہیں لکھاؤں گا۔

کلرک۔ نہیں نہیں پیارے ناراض مت ہو۔ لکھاؤ تو سہی۔

نوجوان۔ بہت اصرار کے بعد۔ اچھا لکھو۔ میں نے اپنے باپ کی قبر چھوڑی ہے

نمبر ۲ - میرے ورثہ میں قلمی کلام پاک کا نسخہ خاندانی طور پر آ رہا تھا وہ اس بھگدڑ میں چھوٹ گیا ہے۔

اگر یہ دو چیزیں تم دلا سکتے ہو تو لکھو۔ ورنہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔

کلرک اور نوجوان ایک دوسرے کو دیکھ کر آبدیدہ تھے۔

مزاج شناس

برے ساتھی سے بہتر یہی ہے کہ بغیر ساتھی رہے۔ انسان کی زندگی بھی عجیب ہے پھر اس زندگی کی ضرورتیں بھی ایسی انوکھی ہیں کہ الامان۔ اس میں تضاد ہے۔ توافق ہے آپس میں ملنا جلنا ہے۔ میل ملاپ کے بعد مفارقت و جدائی ہے۔ دوستی کا یہ حال کہ بغیر دیکھے چین نہیں۔ مگر جب دل نے ٹھکرا دیا تو نام سننا بھی گوارہ نہیں۔ سچ ہے یہاں کی کسی چیز میں بقا نہیں۔ نہ دوستی کا اعتبار نہ دشمنی کا ٹھکانہ۔ ہر چیز آنی جانی ہے۔ اس لئے دوستی میں اعتدال اور دشمنی میں بلند کرداری دو اصول ملحوظِ خاطر ہوں تو تکلیف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی شرافت اور بلند خیالی کا اندازہ اگر لگانا ہو تو یہ پتہ چلائیے کہ دشمنوں سے اس کا برتاؤ کیسا ہے

سکندر اعظم کی عظمت کا راز اس سے بھی ہویدا ہے کہ اس نے شکست خوردہ دشمن پورس کے ساتھ جو شریفانہ برتاؤ کیا وہ پست حوصلہ یا بزدل کا شیوہ نہیں رہا ہے۔

رسولِ عربی نے جو سلوک اپنے ازلی دشمنوں کے ساتھ فتح مکہ کے وقت کیا ایسی مثال تاریخ عالم میں کہاں ملتی ہے۔

اس مہذب دور میں اتحادی قوتوں نے جو بہیمانہ سلوک ہٹلر کے ساتھیوں کے ساتھ کیا۔ اس سے انسانی تاریخ اس بیسویں صدی جیسے ترقی یافتہ اعلیٰ ترین دور میں بھی گھناؤنی ہو کر رہ گئی ہے۔

مزاج شناسی کے بغیر نہ دوستی میں لطف ہے اور نہ دشمنی میں اعتدال ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ ساری خانہ جنگیاں۔ زن و شو کے اختلافات۔ دوستوں کا بچھڑ جانا۔ تمام افراتفری کا معاملہ اسی مزاج شناسی کا فقدان ہے۔ شاید ہی دنیا میں دو خوش قسمت ایسے رہے ہوں جن کے ارد گرد تلخی۔ شک و شبہ اور کدورت نے سر نہ اٹھایا ہو۔

مزاج شناسی کے بعد دوسرا قدم ہوتا ہے راز داری کا جب مزاج میں ہم آہنگی اور یگانگت انسان محسوس کرنے لگتا ہے تو پھر راز و نیاز کی باتیں بھی ضرور ہونے لگتی ہیں۔ اور یہ بھی ایک فطری امر ہے۔

کیونکہ انسان چونکہ سمجھدار ہے۔ مطالعہ کی صلاحیت ماحول کو پرکھنے اور کسوٹی پر کس کر اپنے انا کی تسکین وہی چاہتا ہے۔ چیزوں کو دیکھ کر غور و خوض کے بعد وہ جو نتیجہ اخذ کرتا ہے اس کو وہ دوسروں تک پہنچانے کا فرض بھی ادا کرنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو اس کا قلب ہلکا ہی نہ ہو۔ اس ہلکا کرنے کے عمل کے وقت اس کو راز دار اور مزاج شناس دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اگر خوش قسمتی سے مل جائے تو کیا کہنے۔ مگر اس متاعِ گراں کی نایابی کا شکوہ ہر شخص نے کیا ہے۔ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔ ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو رازِ نہاں ہمارا

اس رازِ نہاں کو انڈیل کر رکھنے کی خواہش ہر سوچنے والے مفکر انسان کو ہوتی ہے۔ اگر اس کو مل جائے تو پھر دنیا اس کے لئے رشک جناں سے کم نہیں۔ معمولی سا معمولی انسان بھی غیر شعوری طور پر اس راز دار کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ فوری طور احساسِ راز داری کا پتہ ملتے ہی وہ رازِ نہاں کو ہلکا کرنے لگتا ہے بکھیر رکتا ہے۔ پھر

قریب تر ہوتا ہے۔ اس عمل پیہم میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ شرمندگی سے دوچار ہوتا ہے پلٹتا ہے۔ پھر دوسرے دلِ دردمند کی تلاش ہوتی ہے اور افسوس کے ساتھ اپنی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

بڑے بڑے باغی وسرکش کے راز قبل پختگی ہی طشت از بام ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کی اسکیمیں ناکام ہو جاتی ہیں۔

دنیا میں جتنے انقلابات آئے اسی رازداری کی صلاحیت نے انہیں پروان چڑھنے کا موقع دیا۔ ورنہ وہ قبل از وقت ہی پھیل کر بکھر جاتے۔!

اس لئے ہر معاملہ میں مزاج شناس کی ضرورت ہے۔ اور بغیر مزاج شناسی زندگی کا کوئی مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔ دوستی کا معاملہ ہو۔ شاگرد واستاد کا معاملہ ہو سیاست کی گتھیوں کو سلجھانا ہو۔ زن وشو کا مرحلہ ہو بچوں کی تربیت کا منصوبہ ہو لین دین کی انجام دہی ہو۔ پیرو مرشد سے رشد وہدایت کا سلسلہ ہو۔ مزاج شناسی کو بڑا اہم اور بنیادی لگاؤ ہے۔

سر ونسٹن چرچل

۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء کی صبح برطانیہ کی تاریخ میں سوگوار رہے گی۔ اس مردِ عزیمت کی موت نے جس نے وزارتِ عظمیٰ پر دورانِ جنگ متمکن ہوتے ہی اپنی قوم سے جو پہلا خطاب کیا اور جو عطیہ پیش کیا وہ لوحِ جاوداں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"میں تمہیں آنسوؤں۔ تکلیفوں اور خون کی پیش کش کرتا ہوں"۔ برطانیہ نے آنے والے دنوں میں اور آزاد دنیا نے اپنے تاریک لمحات میں انہی الفاظ کو سامنے رکھا مشکل ترین انسانی تاریخ میں جب ہٹلر کی فوجیں یلغار کرتی بلا روک ٹوک آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہی الفاظ تھے جو متاعِ کارواں کا کام دے رہے تھے۔ فرانس کی چشم زدن میں پسپائی نے برطانیہ کی دیواریں ہلا دی تھیں۔ ہٹلر نے اب دستک دی اور یہ عظیم ڈھانچہ یوں گرا۔

مگر قوموں کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ چند انسانی شخصیتوں ہی نے تو کیا ہے۔ گرتی دیواروں کو روکنا۔ ڈگمگاتے پاؤں کو اپنی جگہ چٹان کی طرح لم ٹیل کر دینا یہی ہے معجزہ۔ چرچل نے معجزہ ہی دکھایا۔ اس نے اپنی قوم سے جو مطالبہ کیا تھا قوم نے بھی بلا پس و پیش اس کو منظور کیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ آنسوؤں نے کس طرح مسکراہٹ۔ سکون۔ ایثار۔ اولوالعزمی کو قوت نمو بخشی اور ۱۹۳۶ء کی ہولناک جنگ نے اپنی ناامیدیوں، پسپائیوں اور پیہم شکستوں کے باوجود چند سالوں میں آزاد دنیا کی قسمت کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا۔ ۱۹۴۵ء میں ہٹلر کی شکست تاریخ انسانی کی فتح تھی۔ آزاد دنیا نے پھر ایک شاندار کروٹ بدلی۔ اور آج ہم اس پر جتنا فخر و مباہات کریں کم ہے۔ مگر یہ کامیابی مرہونِ منت ہے اس مردِ مجاہد کی جس نے کہا تھا۔ "جنگ میں ثابت قدمی۔ شکست میں سرکشی۔ فتح میں

اولوالعزمی۔ امن میں صلح و آشتی" شیوۂ مردانِ عزیمت ہے۔

چرچل کی موت ایک سانحہ ہے۔ مگر نوے سال کی عمر کے بعد کون زندہ رہنے کی تمنا کرے۔ خصوصاً وہ جس نے دنیا کو چلایا ہو۔ جس کی زندگی کے ایک ایک لمحات متحرک اور بے چین رہے ہوں۔ جس نے تقلید سے ہمیشہ بیزاری دکھائی ہو۔ جس نے ملٹری جرنیلوں اور ماہرین فن کی باتوں پر بھی اپنی ہٹ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ جس کی گردن خودی کی چٹان پر رکھی گئی ہو۔ بھلا اس کو عمر کی چکی کب تک زمین بوسی پر مجبور کر سکتی تھی۔ آخر تنگ آکر چرچل نے اس زندگی کے بوجھ کو بھی ٹپک ہی دیا۔ اب وہ آزاد ہے۔ اور جیسا کہ اس نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ وہ اپنے خالق سے ہر وقت ملنے کے لئے تیار ہے۔

بڑے لوگ جب تک زندہ رہتے ہیں ان کے اردگرد ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے ساری دنیا کو اپنی شخصیت سے متاثر کر لیتے ہیں۔ ہر آفت ناگہانی میں دنیا کی نگاہیں اسی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ بھی تو پسماندگان کو سوچنا ہے کہ اس کون ومکاں میں بڑی متحیر کنندہ صد سالہ زندگی کی کیا نسبت ہے۔ اس ہنگامی زندگی کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے بھی تو دنیا کا نظام اس کی عدم موجودگی میں چلتا ہی رہا تھا۔ پھر موت کے بعد بھی یہ نظامِ کائنات بلا کسی بیّن فرق کے حرکت میں رہے گا۔ تو پھر اس تلافی پر نالہ و بکا کیوں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی شخصیت میں ایک جادو ہوتا ہے جس کا اثر ساری آبادی پر پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریز قوم جو اپنے عادات و اطوار میں قدامت پسند ہے۔ اور یہی اس قوم کی زندگی کا راز ہے۔ اس میں ہمیشہ چرچل جیسی شخصیت آتی ہی رہے گی ان کو اس قدر اظہارِ تفکر اور پریشانی کی چنداں ضرورت نہیں۔ مگر پھر بھی وہ خراجِ عقیدت اور احساسِ تشکر کے غیر فانی جذبے سے اس لئے مملو اور بھرپور ہے کہ اس قوم کو زندہ

رہنا ہے اور سچ بھی یہی ہے کہ ایسی قوم کو زندہ رہنے کا حق بھی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ بادشاہ سے لے کر معمولی شہری بھی اس غم سے بوجھل ہے۔ اور اس غم کو اپنے سینوں میں چھپائے اس طرح محو خرام ہے۔ جیسے وقتی طور پر اس پر سکتہ کا دورہ پڑ گیا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر موت اس تلخ حقیقت کو ضرور سامنے لے آتی ہے کہ ہمارا بھی انجام یہی ہے اس لئے مرنے والوں پر افسوس انسانی فطرت ہے اور مرنے والوں کو اچھے نام سے یاد کرنا بھی فطرت ہی کا تقاضہ ہے۔ خصوصاً مرنے والا جس نے زندہ رہ کر یہ ثابت کر دیا ہو کہ اس نے تمام کمزوریوں کے باوجود اپنی بہادری۔ ہمت اور اولوالعزمی سے موت کو بھی للکارا تھا۔ اور موت بھی اس کی ہیبت سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ۱۹۴۰ سے لے کر ۱۹۴۵ء تک اس کی خوفناک گرج ہی تھی۔ جب اس نے کہا تھا کہ ہم دریاؤں میں لڑیں گے۔ سمندروں میں لڑیں گے۔ ہوائی اڈوں۔ گلی کوچوں میں لڑیں گے۔ مگر ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ اس للکار کی گونج پر لاکھوں سپوت آگے بڑھے اور موت نے انھیں ہمیشہ کے لئے آغوش میں لے لیا جن کی قربانیوں کی یاد میں ہم سال میں ایک بار اپنی گردنیں سکوت میں احتراماً جھکا دیتے ہیں۔ اور آج اس للکارنے والے کی موت پر ہم آنسوؤں کا نذرانہ لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

یہ سوگ و غم گساری تو ہے اس قوم کا جس کے یہاں ہر شخص اپنی جگہ سکندر ہے۔ مگر آئیے ہم اپنا بھی جائزہ لیں۔ ہماری قحط الرجالی ضرب المثل ہے۔ ہم میں اولوالعزم شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ صدیوں کی پائمالی کے بعد اسلامی دنیا نے ایک کمال اتاترک پیدا کیا دوسرا جناح۔ ان کے بعد میدان خالی ہے۔ حالانکہ دنیا کے بہت سے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ مردِ مومن کی عدم موجودگی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر صفحہ ہستی سے فنا ہو رہے ہیں۔ ہم میں جب کسی صاحبِ عزیمت نے جنم لیا خود ہماری ہی قوم نے اسے گرانے کی کوشش شروع کر دی جس سے اس کی پرواز میں

وقتی طور پر تعطل یا تزلزل پیدا ہو گیا۔ مگر باوجود ان رکاوٹوں کے انہوں نے اپنی جگہ محفوظ کرلی۔ سچ ہے کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھاٹیوں کے پار ہو کر نکلا ہے چرچل تو مر گیا۔ مگر انسانی تاریخ میں یہ نام ہمیشہ عزت و جلال سے لیا جائے گا۔ وقت کی صعوبتوں نے چرچل کو جنم دیا۔ رکاوٹیں ہمیشہ اسی لئے پیدا ہوتی رہتی ہیں تاکہ اسے دور کرکے ابھرنے کا موقع ملے۔

کامیاب انسانوں کی زندگیاں رکاوٹوں پر قابو پانے کا نام ہے۔ کامیاب زندگی کا دوسرا نام خاردار وادیوں کا عبور کرنا ہے۔ بڑوں کی زندگی تجربات، ایثار و قربانی خلوص و محبت کی دلچسپ داستان ہے۔ کسی بڑے کی زندگی پڑھو۔ وہاں تلاطم ہے۔ طغیانی ہے۔ مسلسل جدوجہد ہے۔ موت سے قربت ہے۔ دوستوں سے پیمانِ وفا ہے ناامیدیوں سے ٹکراؤ ہے۔ سرفرازی ہے۔ سربلندی ہے۔ امید و بیم کے لمحات ہیں۔ اس کے مرنے کی دعائیں ہیں۔

مگر موت کے بعد اس کی عظمت کا اقرار بھی ہے۔

موت سارے تنازعات کا حل ہے۔

زندگی کی تکمیل کا دوسرا نام موت ہے۔

جیکولین کنیڈی

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء سے پہلے تک امریکہ کی مقبول ترین خاتون مقتول صدر امریکہ مسٹر کنیڈی کی بیوہ تصور کی جاتی تھیں۔ یہ پیکرِ حسن و وفا۔ مجسمۂ شرافت مسلمہ طور پر قابلِ فخر عورت تھیں۔ جن کے ساتھ نہ صرف امریکہ کی ہمدردی تھی۔ بلکہ ساری دنیا کی آنکھوں میں ان کا بڑا بلند مقام تھا۔ مگر مغرب جس کو اپنی تہذیب پر فخر ہے۔ اس نے بلاشک صنعتی میدان میں جتنی عظیم ترقیاں کی ہیں۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ مگر نہایت ہی افسوس ہے کہ اس نے اس ترقی کے زمرہ میں عورت کو جو مقام دیا ہے وہ نہایت ہی بھیانک۔ رسوا کن۔ جنسی بے راہ روی کا اسفل ترین مظہر اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی مثال مسز جیکولین ہیں۔ ان کو خدا نے کیا نہیں دیا تھا۔ دولت۔ عزت۔ اولاد مگر جو چیز یورپ اور امریکہ سے مفقود ہے وہ ہے ایثار و قربانی کا جذبہ۔ وہاں کی ہر چیز نرالی ہے۔ شرم و حیا، محبت و پیار، لطف و اکرام، خلوص و وفا۔ اِن تمام اوصافِ لطیفہ کی کمی نے ان ممالک کو جہنم بنا دیا ہے۔ ساری چیزیں ہیں مگر محبت نہیں۔ اولاد والدین سے بیگانہ۔ والدین ضعیفی میں موت کے انتظار میں اِن کیمپوں میں بسر کرتے ہیں جو اسی کام کے لئے حکومت سے مخصوص ہوتے ہیں۔ لڑکیاں بے راہ روی میں اُن سے آگے ہوتی ہیں۔ جرم اور شرم کی پیداوار روز افزوں ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ کچھ دنوں بعد وہاں اولاد کا تعارف ماں ہی کے نام سے ہو۔

انتالیس سالہ جیکولین نے جو اُنہتر سالہ یونانی کروڑپتی بلکہ ارب پتی سے شادی کی وہ ان کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ امریکہ والے جنہوں نے اس عورت کو بطور مقدس دیوی پیش کیا تھا اس کا حشر اگر یہی ہو تو پھر اوروں کا کیا بھروسہ۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ

کی اولاد ویٹ نام میں بلا وجہ کٹ رہی ہے۔ ساری دنیا میں اس نے خدائی فوج دار کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ بھی سراب کی طرح خود بخود مٹ رہا ہے۔ اولاد کی تربیت والدین سے ہوتی ہے جس ملک کے والدین خود برباد ہوں وہ بچوں کی نگہداشت کیا کر سکتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ امریکی بچے آج تباہی سے جس قدر قریب ہیں شاید کسی دوسری قوم کے بچے اتنے نہیں ہیں۔ اگر امریکہ نے ابراہیم لنکن کو پیدا کیا۔ آئزن ہاور کو جنم دیا تو اسی ملک نے جونس۔ نکسن۔ ہمفرے جیسے ضدی۔ ظالم۔ اور سرپھروں کو بھی اقتدار بخشا۔ پہلے امریکہ قابلِ تقلید تھا اب قابلِ مذمت۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ امریکن عورتیں خود سادہ۔ صاف گو۔ راست باز نہیں ہیں۔ اس لئے اِن اوصاف کے حامل ان کے بچے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب نہیں ہو سکتے تو لازمی امر ہے کہ اب ان میں ہونہار اولاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی مصلح ہو سکتا ہے۔ نہ مفکر، نہ انقلاب کا قائد۔

کون سی ارذل ترین اخلاقی کمزوریاں جو تصور میں لائی جا سکتی ہیں۔ امریکن میں نہیں ہیں۔ نسل فروش۔ حبشیوں سے نفرت۔ جنگ کو بھڑکانے والے۔ کمزوروں پر حملے کرنیوالے خود پسندی، نسل کشی، عصمت فروشی۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر کیوں یہ اب تک زندہ ہیں ؟ سوال یہ ہے۔

میرا خیال ہے یہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ مائل بہ انحطاط و زوال ہیں۔ ایک رنگیلا شاہ ہم نے پیدا کیا تو قوم ڈوب گئی۔ ان میں لاکھوں رنگیلے شاہ ہیں۔ اب یہ ڈوب رہے ہیں۔

والد کی موت پر

موت برحق ہے۔ موت کا دن مقرر ہے۔ مگر مرنے والوں کی عیادت۔ ان سے ملنے کی تمنا۔ ان کے عزیزوں کے لئے ایک فطری امر ہے۔ اس میں رکاوٹ کا پیدا کرنا یا ایسی پابندیاں لگانا جو رکاوٹ پیدا کرنے کے مترادف ہو۔ افسوسناک اور توہین آمیز ہے۔

مجھے افسوس ہے اور تا زیست رہے گا۔ کہ میں اس وقت موجود نہ ہو سکا۔ جب ہمارے والد اس دارِ فانی سے رخصت ہو رہے تھے۔ میری تمنا تھی کہ میں اپنے ہاتھوں سے ان کی خدمت کا شرف حاصل کرتا۔ انہیں آخری رسوم دیتا۔ اور عزت واحترام سے باچشمِ نم ابدی آرام گاہ میں لٹا دیتا۔ اے کاش ایسا ہی ہوتا۔

تقسیم ہند کی تلخیوں کو ان جیسی فطری تمناؤں کے فقدان نے بڑی بے رحمی سے تلخ تر بنا دیا ہے۔ عزیزوں کے اٹھ جانے کا ماتم۔ ان سے نہ ملنے کا غم۔ ان سے ملاقات کی تمناؤں کا فریب پیہم۔ کن کن چیزوں پر نوحہ کیا جائے۔ یہ ساری دشواریاں خود پیدا کردہ ہیں۔ تقسیم ہند کا مقصد باہمی رضامندی ہے۔ دو آزاد مملکتوں کا قیام تھا۔ مگر بدقسمتی سے حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ قتل دخون تبادلہ آبادی۔ جنون و درندگی۔ جذبائیت و بہیمیت ہر جگہ خوفناک طوفان بن کر ناچنے لگیں۔ ہندوستان کی چالیس کروڑ آبادی میں خال خال انسان نکلے۔ سارا ملک آگ وخون میں لپٹ کر ماتم کدہ بن گیا۔ آج تک ان کے رشتے اسی جنون کی ڈگر پر چل رہے ہیں۔

نتیجہ ظاہر ہے آمد و رفت کا فقدان بلا وجہ حائل کر دیا گیا ہے۔ محبت

انسانیت کا نام ونشان ان دو ممالک میں مٹ چکا ہے۔ اس کی زد میں زیادہ تر وہ برباد شدہ لوگ ہیں جو ہندوستان سے یہاں آئے۔ اور یہاں سے اب کہاں جائیں۔ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

والد کی علالت کی خبر بذریعہ ٹیلیگرام جو دس دنوں کی تاخیر سے ملی۔ وہ ۹ مارچ ۱۹۶۷ء کا دن تھا۔ پھر چند دنوں کے بعد جو خبر ملی اس کے سننے کے لئے ابھی ہم تیار ہی ہو رہے تھے کہ طوفانِ غم نے اعصاب کو شل کر دیا۔ دوسرا تار ۱۴ مارچ ۶۷ء یوم وفات کی نشان دہی کر رہا تھا۔ افسوس صد افسوس۔ انا للہ۔۔۔

دنیا کے کسی حصے میں کوئی شخص کہیں سے جانا چاہے جا سکتا ہے۔ مگر تقسیم کے بعد اسی ایک ملک کے دو تقسیم شدہ حصوں میں جانا کارے دارد ہے مگر ضرورت راستوں کی صعوبتوں کو دور کرتی رہی ہے۔ پاسپورٹ کی لاینحل دشواریاں ویزا کی غیر مانوس صعوبتیں۔ اس کے بعد مزید ملکی رکاوٹیں جس کا نام اجازت نامہ کا حصول ہے وہ بھی کسی طرح لے کر افتاں وخیزاں چل پڑا۔ دل بوجھل تھا۔ آنکھیں خشک، قلب میں انقلابی ہیجان۔ دماغ یہ کہہ رہا تھا کہاں جا رہے ہو۔ اب وہ سایۂ عاطفت جس کو تمہاری آنکھوں نے کچھ دن پہلے تک دیکھا تھا۔ رخصت ہو چکا ہے۔ دماغ کی آنکھیں منٹوں میں وہاں پہنچتی رہیں اور ان کی موجودگی کا نقشہ انداز نشست۔ گفتگو۔ میرے پہنچنے پر ان کے چہرے کی بشاشت کا عالم پھر عدم موجودگی۔ ویرانی۔ خموشی۔ بیٹھک خانہ کی سناٹگی۔ تجہیز وتکفین، قبر۔ فاتحہ خوانی۔ غرض ایک ایک تفصیل پر سارے دوران سفر۔ دماغ نے اچھی رہنمائی کی دل بے چین تھا۔ مگر دماغ کہہ رہا تھا ہر چیز فانی ہے۔ دل پریشان تھا کیونکہ باپ کی موجودگی طاقت وسکون کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ عقل کہتی تھی ساری قوتوں کا منبع خدا ہے۔

دل یہ جاننا چاہتا تھا کہ ہماری عدم موجودگی کا شدید احساس والد کو ہوا ہوگا نہ معلوم آخر وقت میں یاد کیا ہو۔ دل کہتا رہا کہ تمہارے والد، عابد و زاہد صابر و شاکر تھے۔ دو جوان بیٹوں کی ۱۹۴۶ء میں شہادت پر بھی راضی برضا رہے۔ دلوں پر پتھر رکھ کر بیٹھ رہے۔ ان کی زبان پاک تھی۔ خدا کا نام ہی تو ان کا شغل تھا غرض ایک ایک پہلو پر مختلف زاویوں سے خیالات کے شعلے آتے رہے۔ اور بجھتے رہے کہ جہان آباد آ پہنچا۔ پھر اپنے گاؤں فیروزی کی طرف روانہ ہوا۔ جیسے جیسے منزل قریب آتی گئی۔ دل کی کیفیت میں خاصی طغیانی پیدا ہونے لگی۔ چار میل کی مسافت شب ہجراں کی طرح طول ہوتی گئی۔ راستے کہہ رہے تھے وہی تو تمہارا مولد و مسکن ہے حالات غمازی کر رہے تھے سب چھوٹ چکے ہیں۔ اب نہ دیس ہے نہ یہاں کی خاک میں الس کا جذبہ۔ محبت جس کا نام تھا۔ وہ بیس سال پہلے ہی داغِ مفارقت دے چکی ہے۔ ہر جگہ اجنبیت۔ بدیسی ہونے کا احساس ستاتا رہا۔ آخر اپنے گھر پہنچا۔

ہر چیز خاموش تھی۔ گھر۔ دروازہ۔ چبوترہ۔ مسجد کا گوشہ ساکت و جامد تھا۔ میری نگاہ متجسس رہی۔ اور اب اس کی جستجو کسی مقصود کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس کو وہ ڈھونڈھنا چاہتی تھی۔ وہ تو مسجد کے شمال میں سینکڑوں من مٹی کے نیچے محوِ خواب ہے۔ میرے دماغ کی پرواز۔ تخیل کی بنائی ہوئی دنیا ہی تو تھی۔

جتنے دنوں تک گاؤں میں رہا ہر نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہی فاتحہ خوانی کو حاضر ہوتا رہا۔ قبر پر پہنچتے ہی ایسا محسوس ہوتا کہ والد کروٹ لے رہے ہیں میں ساکت و صامت فاتحہ کے بعد واپس اسی بنگلہ میں آجاتا۔ جہاں والد مرحوم بیٹھتے تھے۔ صبح و شام یہی معمول رہا۔ اب نہ وہ پیکرِ صبر و رضا کی ذات ہے۔ نہ وہ قناعت

کی بارگاہِ عظیم۔ جو غربت و افلاس میں پر امید مصیبتوں کے ہجوم میں ہمیشہ پر شکوہ رہا سایۂ پدری سے محروم میری ذات تھی۔ جو عہدِ رفتہ کے تاروں کو سمیٹنے کی ناکام کوشش میں کھوئی ہوئی تھی۔ اور مستقبل کا خاکہ خاندان کا پہلا فرد ہونے کی حیثیت سے والد مرحوم کے نیم شبی کی دعاؤں کے سہارے بنانے میں غلطاں و پیچاں ۔ اس طرح بائیس دن گزر گئے۔

میرا ویزا اب آٹھ دن اور تھا۔ تیئیسواں دن روانگی کا دن تھا۔ روانہ ہوا آخری زیارت اور فاتحہ خوانی کے لئے قبر پر حاضر ہوا۔ اب طاقتِ ضبط جواب دے چکی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ لاکھ کوشش کی کہ اس گھونٹ کو بھی پی جاؤں۔ مگر سارے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ قلب و جگر کی اب باری تھی۔ ان پر عقل کا جادو نہ چل سکا اور کچھ وقفہ کے بعد میں ہلکا ہو چکا تھا۔ الوداعی سلام پڑھتا ہوا سلہٹ کے لئے روانہ ہوا۔ سارے سفر میں نورِ چشم شکو سلمہٗ کی معیت بے حد رفیقِ کار رہی۔ ؎

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرے خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار

سترہ روزہ جنگ

جنگ قابلِ ملامت ہے۔ کُشت وخون بھیانک منظر ہے۔ سب سے بڑی دانشمندی یہی ہے کہ اس کو ٹال دیا جائے۔ سب سے بڑی بہادری یہ ہے کہ وحشیانہ جذبات کو محکوم ومغلوب کر کے رکھا جائے۔ مگر کچھ واقعات کے سلسلے پے در پے یا غیر مربوط طور پر ایسے امنڈتے چلے آتے ہیں کہ یہ ناگزیر بن جاتی ہے۔ چنانچہ ۶ستمبر ۱۹۶۵ء کی ہندوپاک لڑائی بھی اسی شمارہ میں ضبطِ تحریر کی جاسکتی ہے۔ لڑنا بُرا ہے، مگر جب عزت خطرے میں ہو تو یہ فرض ہے، ورنہ ہر سرپھرا سرِ راہ آپ سے دست وگریباں ہوگا اور اپنی اس حرکت سے وہ اپنے آپ کو محفوظ وماموں سمجھے گا۔ کیونکہ اسے یہ معلوم ہے کہ متاثرشدہ جواب نہیں دیگا۔ اس طرح فتنوں کے بہت سے دروازے کُھل جائیں گے

ہندوستان کے اچانک حملے کا ایک جواب یہ بھی ہوتا کہ اس طوفان کے آگے سر جھکا دیا جائے۔ اس قیامت خیز اقدام کے تحت ہتھیار ڈالدیا جائے۔ یا اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔ دوسری صورت میں تباہی کے ساتھ ہزاروں کا قتل ہے، بستیوں کا اُجڑنا ہے، شہروں کا برباد ہونا ہے۔ مگر یہ بربادی تباہی سے گزرنا، کروڑوں انسانوں کے لئے زندگی کا پیغام۔ دشمن کی بڑھتی ہوئی فوجوں کو روک دینا۔ ہزاروں آفتوں کا سدِباب ہے، کچھ جانیں کام آئیں، کچھ سہاگنیں بیوہ ہوئیں، کچھ بچے یتیم ہوئے، مگر رہنے والی بیویاں، بچے ہوئے قوم کے ہونہار۔ اِن بربادیوں کے سہارے باعزت زندہ رہنے کے مستحق ہوگئے، کون نہیں جانتا کہ عزیز بھٹی کا خاندان برباد ہوا، کون کہہ سکتا ہے

کہ میجر شفقت، اور میجر طفیل کے بچے سایۂ پدری سے محروم ہو کر بھی خوش رہیں گے
مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہزاروں خاندان اور لاکھوں بچے ان کی قربانیوں کی بدولت ہی زندہ، خوش اور روشن مستقبل کی راہ پر اکڑتے ہوئے چل رہے ہیں۔ خدا نخواستہ اگر یہ مردِ آہن کی طرح چٹان بن کر دشمن کا مقابلہ نہ کرتے۔ اگر یہ شہیدانِ لاہور و سیالکوٹ دشمن کے پاؤں ڈگمگانے میں کامیاب نہ ہوتے، اگر یہ مجاہدین نشۂ شہادت میں سرشار عشق ناموسِ وطن سے پہلو تہی کرتے تو ان کی زندگی موت سے بدتر ہوتی، انہوں نے موت کو اس وقت لبیک کہا جب وہ اس سے گریز کر سکتے تھے۔ مگر اس گریز کے بعد اگر وہ موت کی تمنا کرتے تو بھی وہ ان سے بہت دور رہتی، وہ تو شاید بچ جاتے، مگر قوم مر جاتی
یہ مختصر تیز و تند جنگ بڑی ڈرامائی انداز میں آئی۔ قوم نے جس خندہ پیشانی، یک جہتی اور ایثار کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال اوراقِ تاریخ میں شاید ہی مل سکے، مغلوں کے زوال کے بعد انگریزوں کی غلامی کا جوا پھینکتے ہی مسلمانوں کی قسمت میں جو علاقہ دیا گیا، وہ اس سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تھا کہ چند دنوں میں یہ قوم گھٹنے ٹیک دیگی۔ اور پھر اکھنڈ بھارت کا خواب پورا ہو جائے گا مگر جس قوم میں معرکۂ لاہور اور سیالکوٹ جیسے سرفروشان نقدِ جاں لیکر مورچوں میں ڈٹے ہوں۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کو زیر نہیں کر سکتی۔
ہماری فوج پر تو قوم کا اعتماد تھا ہی، عوام نے جو کارگزاریاں انجام دیں اس پر آنے والی نسلیں اور دنیا کی قومیں فخر کریں گی۔ عورتوں نے، بچوں نے میدانِ کارزار میں، گولوں کی بارشوں میں، دندناتی ہوئی مشینوں کے سامنے، ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جو مظاہرہ پیش کیا، وہ قابلِ صد رشک ہے

وفورِ جذبات سے طوفان آنکھوں میں اُمنڈ آتے ہیں، حوصلے بلند ہو جاتے ہیں، اور سر فخر و انبساط سے بلند ہو جاتا ہے

اس جنگ نے یہ بھی سبق دیا کہ قوم اسلام کے نام پر سب کچھ قربان کر سکتی ہے میدانِ کارزار میں لاہور کی سرزمین جس خون سے سیراب ہوئی وہ مسلمان سپاہی بنگالی ہی تھے۔ جب لڑے تو وہ صرف مسلمان تھے، بنگالی نہیں تھے۔ شہید ہوئے تو مسلمان تھے، شہادت کے بعد جب وہ غیر فانی ہوئے تو مسلمان ہی کی حیثیت سے، دنیائے اسلام کے نوجوانوں کو جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کی مستیوں سے ہمیشہ ہمیشہ سرشار کرتے رہیں گے۔ اِن مسلمانوں کی تکبیریں "نعرۂ حیدری" عالمگیر نوعیت کی تھیں، جو جنگ بدر سے آج تک میدانِ کارزار میں دشمنوں کے دلوں کو ہلاتی رہی ہیں۔

اس جنگ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ قوم ہر آزمائش کے لئے تیار ہے، قوم کا ہر فرد مزدور سے لے کر رئیسِ اعظم تک وقت کے ہر تفرقہ کو مٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے ہمارے جوہر کا پتہ اس وقت چلا جب ساری قوم نے متزلزل ارادوں سے آگے ہی بڑھنے کو مقصدِ حیات سمجھ کر یہ بتا دیا کہ کوئی آئے اور کام لے۔

اٹھارہ سال کی طویل مُدت رسہ کشی اور سیاست گردی میں گزر گئی۔ صاحبِ اقتدار مغلوب گمان بن گئے۔ اقتدار ان کے پاس اتفاقی طور پر جا پہنچا جنھیں عوام سے کوئی تعلق ہی نہ تھا، وہ ہمیشہ ہندوستان کی آبادی، طاقت اور وسائل کو دیکھ کر حساب لگانے کے عادی تھے۔ نہ ان میں جاں فروشی اور جاں بازی کا جذبہ تھا اور نہ ان میں خدا کی ذات پر یقین۔ یہ یقین اس وقت ہوا جب دشمن کے سارے اعداد و شمار کے بھاری بھر کم مینارے لاہور اور سیالکوٹ کے مٹھی بھر جیالوں نے قیامت خیز آہنی بارش کو مٹی میں ملا کر رکھ دیا

دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بے چینی سے منتظر حساب پر یقین کر کے نتیجہ کے لئے غیر مطمئن تھیں۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے خوابیدہ جذبات شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں گے۔

قومیں ہر روز نہیں لڑتیں۔ ان کی بہادری کے جوہر وقت آن پڑنے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ سترہ روزہ جنگ میں قوم نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کس خمیر سے تیار شدہ ہیں۔ لڑائی کیا ہے، توپوں کے دہانوں سے اگلتے ہوئے لاوے انکی ٹینکوں کی قیامت خیزیوں کو کس طرح منٹوں میں فنا کر دینے کی صلاحیت پر قادر ہیں ہوائی جہازوں سے ہزار پونڈ کے گولے انھیں نہ گھر چھوڑنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور اور نہ راہِ فرار پر آمادہ۔ موت کو انہوں نے ڈھونڈھ کر بجلیوں کے آشیانوں سے نکالا۔ موت نے ان کو مرعوب نہیں کیا، اس لئے وہ زندہ ہیں، اور ٹینکوں کی یہ سب سے بڑی جنگ شاید ہندوستان و پاکستان کی فیصلہ کُن اور تعلقات کے رُخ کو پھیر دینے والی ہی نہ ثابت ہو۔ آمین۔

اس جنگ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اساسِ حکومت عوام کی وفاداری پر منحصر ہے۔ وفاداری کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جن کے ذمے حکومت کی باگ ڈور ہے ان کے سر میں ایک ہی سودا ہے، بہبودیٔ عوام اور خوشنودیٔ عوام۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب عوام کی غیر خوشنودی کا ذرا بھی احساس حکومت کے حرم سرا نشینوں میں محسوس ہو تو وہ فوراً مسندِ حکومت سے علیحدگی ہی کی صورت میں جلوہ پذیر ہوں، اس کا اندازہ جمہوری نظام کو استوار کرنا ہے، جتنا یہ نظام بہتر ہوگا اسی قدر اس کا اندازہ یقینی اور حتمی ہوگا۔

حکومتیں جو یک بیک الٹ دی جاتی ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ عوام کے جذبات کے اندازے لگانے کی مشینری مفلوج کر دی جاتی ہے، ان کے دل کی دھڑکنوں

کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، لازمی طور پر اس کا نتیجہ انقلاب، کُشت و خون یا ملک بدری، مارشل لار، مصیبتوں میں نظر آتا ہے، جنگ کے دوران عوام کے دل کی دھڑکنوں کو حکومت نے کس طرح سُنا۔ اور عوام نے بھی حکومت کے ایماء پر کس طرح سب کچھ نچھاور کر دیا قابلِ صد رشک ہے۔

دورانِ جنگ مغربی اور مشرقی پاکستان کو ملانے والی کون سی طاقت تھی جس نے دو علیحدہ حصّوں کو اس طرح اتصال اور استحکام بخشا جیسا کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ میں نے جو آخری فقرہ جوڑا ہے اس کی بھی کوئی وجہ ہے، اتصال اور اتحاد تو تھا مگر دیکھنے میں نہیں آیا تھا، کیونکہ یہ چیزیں غیر مرئی ہیں۔ دونوں حصّوں میں بُعد المشرقین ہے۔ مگر اُس وقت قُربت کی ایسی لہریں دونوں کو اس طرح ملا رہی تھیں گویا بُعد کا لفظ ہی ان کے لئے منسوب کرنا غلط ہے۔ ریڈیو کی ایک ایک تان پر لوگوں کو نویدِ روح افزا ملتی رہی، ہماری فوج کا کونسا دستہ لاہور، چھمب، سیالکوٹ اور راجستھان کے محاذ پر سرگرمِ عمل ہے۔ کون شہید ہوا، کس کے ہاتھ میں عَلَم ہے۔ کس نے دریائے توی کو عبور کیا۔ جوڑیاں کی سرزمین کس کے خون سے سیراب ہوئی، چونڈہ اور پسرور کے علاقوں میں بہادروں نے کونسا غیر فانی کارنامہ انجام دیا، شہادت حاصل کرنے کے لئے فوجوں نے کون کون سے انوکھے حربے استعمال کئے۔ اور بارگاہِ ایزدی میں پہنچنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کے مقابلے میں موت کس طرح بھاگتی پھری ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کُشائی (اقبال)

اس ہوائی اتحاد (ریڈیو) سے بڑھ کر اس دور میں کوئی اتحاد ہی نہ تھا، ان تمام

اتحادوں کا سرچشمہ تھا اسلام۔ کفر سے نفرت۔ غلبۂ کفر سے نفرت

ہندوستان کے احسانات پاکستان پر ان گنت ہیں۔ تقسیم کے بعد سے ہندوستان کی غیر رواداری۔ ضروری چیزوں کا پاکستان بھیجنے پر انکار۔ وجودِ پاکستان سے تمسخر، ہندوستانی مسلمانوں پر آئے دن مظالم، کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اور پھر بغیر اعلانِ جنگ حملہ

میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر رواداری برتی جاتی تو پاکستان بہت پہلے ہی تباہ ہو جاتا۔ تجارت آسان کر دی جاتی تو پاکستان بہت پہلے ہی تباہ ہو جاتا۔ اگر تمسخر نہ کیا جاتا تو پاکستان اپنے وجود کو ثابت کر دکھانے میں اتنی شدّت نہ اختیار کرتا۔ اگر فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوتے تو مسلمان نہ دولت لاتا نہ تجارت بڑھاتا اور نہ بڑے بڑے ہندوستانی مسلمانوں کے دماغ ہی پاکستان آنے پر مجبور ہوتے۔

پاکستان پر حملہ اگر اعلانِ جنگ کے بعد ہوتا تو میرا یقین ہے کہ پاکستان کبھی نہ لڑتا۔ اٹھارہ سال تک تو کشمیر کا مسئلہ امریکہ، برطانیہ کی ٹھوکریں کھا کھا کر گزرا مگر ان طاقتوں نے جنھیں حلیف ہونے کا بھی دعویٰ تھا۔ معاملہ کو اور پیچیدہ کر دیا، روس کھلے بندوں حق تنسیخ استعمال کرتا رہا۔ اگر اعلانِ جنگ ہوتا تو پھر ان درگاہوں کی چوکھٹوں پر پاکستان کے کرتا دھرتا دھونی رما کر بیٹھ جاتے، دہائیاں دیتے واویلا مچاتے کہ بلا ٹل جائے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ عوام سے دوری کی بنا پر ان کے جوہر سے لاعلمی۔ مگر جب حملہ ہو گیا تو لڑنا ہے اور لڑا گیا۔ اور ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ ؎

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا ۔۔۔۔۔۔ سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ہندوستان پاکستان سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ یہ عقل کی بات ہے۔ مگر لاہور، سیالکوٹ، راجستھان میں جو کر کے دکھایا گیا وہ ایمان کی بات ہے۔ پاکستان پائندہ باد

•

شہادت گاہِ اُلفت میں اجل آواز دیتی ہے

جسے آنا ہے آئے۔ لے حیاتِ جاوداں مجھ سے

۴ر نومبر ۱۹۶۸ء

سفارش

میں نے ایک غریب لڑکی کے میڈیکل کالج میں داخلہ کی سفارش اپنے ایک دوست ڈاکٹر سے کی۔ ڈاکٹر موصوف کالج کی انتخابی کمیٹی کے با اثر ممبر تھے گرچہ لڑکی پڑھنے میں اچھی تھی۔ اس کے نمبر بھی اوسط لڑکوں سے بہتر تھے۔ اس کی شخصیت بھی اوسط لڑکے لڑکیوں سے کم نہیں تھی۔ لیکن ایک بڑی کمزوری جو اس کے ساتھ تھی وہ اس کے باپ کا معمولی طبقۂ ملازمت سے تعلق تھا جس کی بناء پر ارباب اقتدار اس کی طرف ہمدردی پر مائل نہ ہو سکے۔ بلکہ میری سفارش سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگی اور جذبۂ ہمدردی کے بجائے اس بات کی رسہ کشی شروع ہو گئی کہ وہ منتخب نہ ہو۔

دوسری بات جو اس کے خلاف گئی وہ یہ تھی کہ لڑکی کے باپ نے اپنی مختصر سی ملاقات کا سہارا لے کر پرنسپل کالج سے مل لینے کو مناسب سمجھا۔ پرنسپل نے ملنے سے انکار تو نہیں کیا۔ ہاں اس نے اس ملاقات کو اس بات پر محمول کیا کہ اس مختصر سے آدمی کو ایسی ہمت کیوں ہوئی۔ جس نے مجھ جیسی اہم شخصیت سے ملنے میں بھی تامل نہیں کیا۔ آخر انٹرویو ہوئے۔ اس سے کم استعداد۔ کم نمبر حاصل کرنے والے لڑکے لڑکیاں منتخب کر لیے گئے۔ اور اس کو منتخب نہ کرنے میں ہر شخص نے اپنی طاقت کا استعمال کیا نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ منتخب نہیں ہو سکی اور اس طرح ایک ہونہار طالبہ اپنی تعلیم سے محروم کر دی گئی۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے ارباب اقتدار سے تذکرتاً اس بات پر اظہارِ افسوس کیا

اس کا جواب مندرجہ ذیل مفہوم میں پیشِ خدمت ہے۔

ڈاکٹر صاحب یہ بڑا بُرا ہوا کہ ایک باصلاحیت لڑکی اپنے جائز حق سے بلاوجہ محروم کردی گئی۔

ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی کیوں اس لڑکی کی مدد کے لئے آگے بڑھتا۔ کسی کی سفارش اس لئے کی جاتی ہے کہ اگر کبھی سفارش کرنے والے پر بھی کوئی وقت ایسا آئے تو اس کی پہنچ وہاں تک ہو اور مفید حل نکل آئے۔

یا جس کی سفارش کی جارہی ہے وہ ممنون رہے اور بوقت ضرورت اس کا بدل پیش کرنے کی صلاحیت اس میں موجود ہو۔

میں نے کہا کہ تیسری صورت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ سفارش کرنے والا مستحق شخص کی سفارش اس لئے کرے کہ اگر کسی کا بھلا ہو جاتا ہے تو اس کو خوشی ہونی چاہیئے۔ اور یہ جذبہ کارفرما ہے کہ صحیح سفارش سے خدا خوش ہوگا۔

لوجہ اللہ سفارش کرنا مسنون ہے۔ قبول کرنا نہ کرنا اس شخص کا کام ہے جس کے پاس سفارش پہنچائی گئی ہو۔ کیونکہ وہ اپنی مصلحتوں کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ اس لئے لوجہ اللہ سفارش میں۔ سفارش کرنے والا ہر حال میں خوش رہتا ہے۔ اس کے دل میں عدم قبولیت سے کبیدگی نہیں ہوتی ہے۔ قبولیت کی صورت میں یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ کسی کے کام تو آیا۔ انسان وہ ہے جس سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ اس لئے سفارش میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اور سفارش کسی لالچ یا امید کی خاطر خود فریبی ہے۔ بلکہ کسی کی مدد بھی کسی امید کے ماتحت بڑا ہی غلط اقدام ہے۔

ایک مغالطہ جو اس سفارش کے زمرہ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر معاملہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ جو مستحق ہے اس کا انتخاب تو ہو ہی جائے گا۔ اس لئے سفارش کسی طرح کی ہو دوسروں کی حق تلفی کے مترادف ہے۔ بظاہر تو یہ بڑا اچھا خیال ہے

مگر اس میں مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ یہ منفی خیال ہے جو صحیح نظریہ کا حامل نہیں ہوسکتا۔

سفارش کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ لائق آدمی منتخب ہو۔ دوسرا یہ کہ اپنا آدمی یا اپنے تعلق کا آدمی یا اپنے خیالات کا آدمی برسر اقتدار آئے۔ اس سے فوائد ایسے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ دنیاوی امور میں رازداری امداد باہمی۔ خیالات کی ہم آہنگی کی ضرورت ہر شخص کو ہر قدم پر آئے دن پیش آتی رہتی ہے۔ اس دنیا میں اگر عزت سے رہنا ہے تو اس کے لئے کچھ تدابیر، کچھ رعایتیں۔ کچھ قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ صرف دنیاوی امور میں بلکہ دینی معاملوں میں بھی سفارش کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے مظالم سے نجات حاصل کرنے اور بنی اسرائیل کے حیلے بہانوں سے بچنے کے لئے خداوند تعالیٰ سے جو سفارش یا درخواست کی اس میں اپنے بھائی ہارون کے متعلق یہ فرمایا کہ انھیں میرا وزیر بنا۔ وجہ یہ بتائی کہ ہمارے دل کو اطمینان ہو۔ اور تجھے یاد کرنے کا زیادہ موقع مل سکے ظاہر ہے کہ جب اپنا بھائی۔ عزیز معتمد علیہ کسی اقتدار کی کرسی پر ہو تو ہر طرح سے تقویت قلبی ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ رازداری قائم رہتی ہے۔ دشمنوں کے نرغے سے محفوظ رہتا ہے۔ مصیبت کے وقت آسانی سے پہنچ ہوتی ہے۔ اپنی آواز کے پہچانے میں کوئی تکلیف یا دقت کا سامنا نہیں ہوتا۔ پھر اپنا حلقہ اثر بڑھتا ہے۔ جس سے اپنے صحیح خیالات کی وسیع پیمانے پر ترجمانی کے لئے راستے ہموار ہوتے ہیں۔ ہاں اگر سفارش ایسی ہو جس سے نالائق امیدوار کو لائق پر ترجیح دی جائے یا کسی امید و خوف کے جذبہ کے تحت سفارش کی جائے تو یقیناً یہ کھلی بے انصافی ہے۔ ہر سمجھدار انسان اس سے گریز کرے گا۔

حضرت عمر بن عاص کا قول کتنی صداقتوں کا حامل ہے۔ جو آپ نے فرمایا کہ بہت سے لائق آدمیوں کے مرنے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا۔ جتنا ایک نالائق شخص کے برسر اقتدار

آنے سے ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس دور میں بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

سفارش کا ایک اور پہلو بھی ہے اور قابلِ غور ہے جس کی سفارش کی جاتی ہے تو گویا اس کا تعارف بھی ہو جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے متعلق اچھی رائے رکھنے والے لوگ ہیں۔ اس تعارف کے ساتھ اگر وہ کامیاب ہوا تو ملازمت دینے والا شخص آسانی کے ساتھ اس پر بھروسہ کرسکتا ہے۔ برخلاف اس کے ایسا آدمی جو بغیر سفارش کے آیا ہو۔ اس شخص کو اپنی شخصیت کی افادیت کو ثابت کرنے میں کچھ دن لگیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ معیار تک پورا نہ اُتر سکے۔ یا اسی کے دوران کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں جو جدائی کا باعث بن جائیں۔

سفارش کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سفارش کرنے والے کی عزت جس کے پاس سفارش کی ہو مسلم ہو۔ بغیر کسی ذاتی تعلق کے سفارش کا اثر ہمیشہ الٹا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ نے ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ یقیناً اس کی بھی ذمہ داریاں ہیں۔ اس لئے اس کو بغیر کسی جائز خطرۂ حق تلفی یا عدم توجہی کے خواہ مخواہ سفارش کے بوجھ سے دبانا خلافِ مصلحت ہے۔ اس کے علاوہ جس کے پاس سفارش پہنچائی جارہی ہے اس کے مزاج سے واقفیت حاصل کرنا بھی ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ بہت سی طبیعتیں ایسی لطیف اور نازک ہوتی ہیں جن کے لئے یہ بارِ گراں برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور اس میں کام خراب ہونے کا خطرہ زیادہ ہے۔

(۱) خلاصہ کلام یہ ہے کہ سفارش لوجہ اللہ کارِ خیر ہے۔

(۲) سفارش کرنے والا بااثر ہو۔ اس میں آہ و بکا یا لجاجت کا عنصر نہ ہو۔ کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

(۳) جس کے پاس سفارش کی جارہی ہو۔ اس کے مزاج کو جاننا بھی بیحد ضروری ہے سفارش کے جتنے پہلو اب تک واضح کئے گئے ان میں یہ ہرگز نہیں فراموش کرنا چاہیئے۔ کہ اس میں صلاحیت کا عنصر قابلِ غور ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ اقربا پروری کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ اقربا پروری بذاتِ خود کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ زکوٰۃ کی تقسیم۔ زکوٰۃ کی ادائیگی۔ عزیزوں سے تلطف۔ رشتہ داروں کی مدد یہ اچھی چیزیں ہیں۔ ان کا حکم قرآن نے دیا ہے۔

دنیا کی مہذب شخصیتیں اِن اوصاف سے متصف تھیں اور ہیں۔ البتہ اقربا پروری اس وقت بری ہے جب دوسروں کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے۔ مثلاً ایک شخص اپنوں میں اپنی جیب سے جتنا چاہے دے نہ کوئی برا کہے گا اور نہ مطعون ہوگا۔ ہاں برا اس وقت ہے جب اپنی جیب محفوظ رہے اور دوسروں کو اس کے حقوق سے محروم کرکے ایسے شخص کو ترجیح دی جائے جو اس کا مستحق نہیں ہے۔ یہ صرف اس جذبہ کے ماتحت کیا جائے کہ فائدہ حاصل کرنے والا شخص صاحب اقتدار کا کسی نہ کسی طرح رشتہ دار ہے۔ ایسی سفارش کرنے والا بد دیانتی کا ارتکاب کررہا ہے۔ اور ایسا فائدہ حاصل کرنے والا ہمیشہ اچھے لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکتا رہے گا۔

انڈیا ونس فریڈم

INDIA WINS FREEDOM

مولانا آزاد کی کتاب India wins freedom میں نے گیارہ گھنٹوں میں شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی. کتاب کیا ہے واقعات کا مجموعہ. صداقت اور اولوالعزمی کی غیر فانی دستاویز. جدوجہد آزادی کی ٹھوکروں کا سنگِ میل. افسوس وہ نقشہ جس کو مولانا چاہتے تھے. اُبھرتے ابھرتے رہ گیا.

کاش ہندوستان متحد ہوتا. اور ہندو مسلمان ایک ہوتے وطن کی عظمت دوبالا ہوتی اور غریب الوطنی معدوم.

کتاب پڑھنے کے بعد وہ واقعات جو مرورِ ایام کی وجہ سے ماند پڑ گئے تھے. ابھرتے نظر آتے ہیں. کیا اس ناامیدی میں اُمید کی کرن بھی نظر آئے گی. سنتا ہوں کہ خزاں کے بعد بہار ہے شاید اس کی بھی کوئی بہار ہو.

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے کتاب مذکور میں جو واقعات قلم بند کئے ہیں وہ حقیقت ہیں. مگر واقعات جلد جلد یکے بعد دیگرے رونما ہوتے گئے. کچھ تو ان کی شخصیت نے پیدا کئے اور حل کئے. کچھ ایسے تھے جو دوسرے پیدا کر رہے تھے مگر حل کرنے کی کوشش کے باوجود وہ ان کی بس سے باہر تھے. اسی کانگریس کی دنیا

میں پٹیل. گاندھی اور دوسری ان گنت ہستیاں ایسی ہیں جن کے کردار اس نصب العین کے بالکل خلاف تھے. جس کی پرچار ہندوستان کی گونگی۔ خاموش. خوابیدہ مخلوق کے منشا کے خلاف ہو رہی تھی. وہ یہ نہیں چاہتے تھے جو ہوا۔ بلکہ وہ متحدہ ہندوستان کے خواہاں تھے۔

مسلمانوں پر یہ الزام کہ تقسیم کے یہ باعث ہیں غلط ہے. کیونکہ مسلمان ہر اُس نظریہ کا جس سے اتحاد کو دھکا لگے مخالف تھا۔ اس نے اپنا کوئی مطالبہ پیش نہیں کیا. بلکہ ہمیشہ دفاعی جنگ میں غلطاں و پیچاں رہا۔ کچھ تو اپنی آبادی کی وجہ سے جو اقلیت کہی جا سکتی تھی بچتا رہا اور کچھ اکثریت کے غلط اندازِ فکر سے وہ خائف رہا۔ اس خوف کو دور کرنے کا موثر ہتھیار اکثریت کے پاس تھا۔ اور ہر جگہ کی اکثریت کے غلط اندازِ فکر سے وہ خائف تھا۔ اس خوف کو دور کرنے کا موثر ہتھیار اکثریت کے پاس تھا. اور ہر جگہ کی اکثریت اقلیت کے خوف کو دور کر سکتی تھی۔

مگر تیسری طاقت کی موجودگی اور اس کے رویہ نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اقدامی طور پر کوئی مطالبہ پیش کریں آخر اس کا بھی وقت آگیا۔ اور سنہ ۱۹۴۰ء کا سال بھی اس برِصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گا. کیونکہ اسی سنہ میں معرکۃ الآراء فیصلہ اس منتشر قوم نے یکجہتی سے پیش کیا. چشمِ زدن میں نقشہ ہی بدلتا نظر آنے لگا۔

مولانا مرحوم کی دور اندیشی. جادو بیانی اور شخصیت اس کے بعد بالکل ماند پڑ گئی. پھر بھی اصولی طور پر مولانا اپنے نظریہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے حالانکہ وقت نے بتایا کہ مولانا اپنے خلوص میں بالکل بے لوث ہیں مگر وہ تنظیم جس کی رہبری کرتے رہے ہیں ان کا ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق ہرگز نہیں دے سکتی چنانچہ وہی ہونا تھا جس کا نقشہ شاطرِ سیاست بچھائے ہوئے تھے۔ ایک طرف

تو جناح کی شخصیت کے آگے کانگریس بے بس نظر آنے لگی۔ دوسری طرف انگریزوں کو سوائے تقسیم کے دوسری صورت دکھائی نہیں دے سکی۔ آزادی کا پروانہ دینے کے لئے انگریز کو ہندوستانیوں سے زیادہ جلدی تھی۔ آزادی تو مل گئی مگر خونریزی اور بے کسوں کی لاشوں کے ڈھیر پر یہ پرچم لہرائے گئے۔

مولانا مرحوم کی قسمت میں اس آزادی نے یکے بعد دیگرے دھکے دیئے پٹیل کی ذہنیت تو کھلم کھلا تیغ بُراں تھی۔ نہرو پٹیل کی زد سے نہ بچ سکے۔ وہ تقسیم کے علمبرداروں میں چوٹی کے لوگوں میں ہو گئے۔ نہرو نے گاندھی کو متاثر کیا۔ اور اب تقسیم ہند ایک مسلّم شئے تسلیم کی جانے لگی۔ کاش اسی تقسیم کو جس طرح ہندوستانی کا معمر اور دور اندیش لیڈر راجگوپال اچاریہ بہت پہلے مان چکا تھا۔ ساتھ ساتھ کانگریس کے کرتا دھرتا مان لیتے تو یہ رسوائی اور کروڑوں انسانوں کی بربادی تو رک جاتی۔ قسام ازل نے اس کو لکھدیا تھا اور یہ ہونا تھا ہوا۔

گاندھی نے کہا تھا اگر کانگریس تقسیم منظور کرتی ہے تو یہ ہماری لاش پر ہوگا۔ جب تک میں زندہ ہوں میں تقسیم ہند پر کبھی راضی نہیں ہوں گا۔

کانگریس کے خداؤں نے تقسیم کو منظور کر لیا۔ گاندھی ہاں اور نہیں کے درمیان منظور فرما چکے۔ مونٹ بیٹن کے سارے وعدے مولانا سے غلط ہوئے۔

ہند تقسیم ہو گیا۔ ہندوستان آزاد ہے۔ پاکستان آزاد ہے مگر سچی آزادی کہیں نہیں۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے خاموش ہیں۔

اصل تیپ کا بندیہ اعادہ ہے کہ سورج ۔ آسمان ۔ پہاڑ ۔ دریا ۔ دو دریاؤں کا سنگم طلوع و غروب ، ستاروں کی جھلملاہٹ ۔ کھیتی ۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار ۔ کیا ہماری خدائی کے لئے کافی نہیں ہیں ۔ غور کرو ۔

زیادہ زور قدرت نے اس بات پر دیا ہے کہ تدبر سے کام لو ۔ باریکیوں تک پہنچنے میں جو جو آلات انسانی جسم میں رب العالمین نے لگائے ہیں وہ کام میں لائے جائیں ۔ خدا نے اپنی حکمت کو سمجھنے کے لئے دو آنکھیں دیں ۔ دو کان دیئے ۔ ناک سامنے کی جانب لگائی جو اس قدر حساس ہے کہ گرم و ٹھنڈی ہوائیں ۔ بدبو ۔ خوشبو دور کے جھونکے اس کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے ۔ اگر یہ تمام اعضائے رئیسہ کام نہ کر سکیں یا قلب سلیم کو سیری نہ بہم پہنچا سکیں تو پھر زبان جو محفوظ ترین ودیعت خداوندی ہے ۔ اس کو جنبش میں لانا چاہیئے ۔ یہ ہے قدرت کا منشا ۔ مگر ہمارا عمل ٹھیک اس کے برعکس ہے ۔

جو چیز اس قدر محفوظ اور چھپی ہوئی ہو اس کا استعمال اتنا عام اور حد درجہ اعتدال سے باہر ہو کتنا صریح ظلم ہے ۔

یہ تو تمہید تھی ۔ اب اس کسوٹی پر ہمارے ناصح حضرات کو کسئے ۔ ان کی زبان صرف اسی لئے ہے کہ اس سے ہمیشہ بلا ارادہ کام لیا جاتا رہے ۔ نصیحتوں کا بوجھ آئے دن پھینکنا خصوصاً جب سنانے والا ۔ خود کمزوریوں کا پنڈل ہو کیسے گوارہ کیا جا سکتا ہے گر گوارہ کر بھی لیا جائے تو پھر ایسی نصیحتوں کا ردِ عمل الٹا ہونا لابدی ہے ۔ اسی لئے ہماری قومی زندگی صرف قوالوں کی ہے فعالوں نا پید ہیں ۔ ہمارے رہبر ۔ مذہبی پیشوا عام لوگوں سے زیادہ برے ہیں ۔ اکثر ان میں ایسے ہیں کہ اخلاقی معیار پر ان کا کوئی مؤثر وجود نہیں ۔ عام حالت یہی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں اچھے بھی ہیں مگر ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے ۔

خطاب بہ ناصح

خدا نے قرآن پاک میں اپنی تخلیق کا ذکر کیا ہے اور بار بار دہرایا ہے کہ تم ان کو دیکھو. سمجھو. غور کرو. ہماری ربوبیت کا اقرار کرنا تمہارے لئے لابدی اور وَلے بر ندش ہے اس سے مفر نہیں۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے۔ تبلیغ ہر جاننے والے کا فرضِ اولین ہونا چاہیئے۔!

تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکرہ

یعنی اچھی باتوں کا حکم اور بری باتوں سے روکنا

اخلاقیات کا پہلا زینہ ہے۔ مگر جو مبلغ ہے اس کو کیسا ہونا چاہیئے. اس کے علاوہ تبلیغ زبان ہی سے کہہ دینے کا نام تو نہیں ہو سکتا. بلکہ جو مبلغ ہے اس کی زبان اور اس کا کام ایک جیسا ہونا ضروری ہے۔ تبلیغ اگر کہدینے کا نام ہوتا قطع نظر اُسکے کہ کہنے والا کیسا ہے تو پھر قرآن آتا پیغمبر کی ضرورت نہیں تھی۔ پیغمبر تو اسی لئے مبعوث کئے گئے کہ زبان اور لفظی قرآن کو عمل اور معنوی باریکیوں سے تطابق دے کر بتایا جاسکے کہ تبلیغ یہ ہے. ہر شخص کا اٹھنا بیٹھنا اس کی شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ بولنا اور خاموش رہنا یہ بھی شخصیت کے عنوان ہیں. اس زمانہ میں جبکہ نصیحت کرنا عام شیوہ ہو چکا ہے۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ اور اسی کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر کام کیا جائے. اس ناصح کی نصیحت جو عمل سے خالی ہو دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے اور قلب سلیم

ماننے سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

مولویوں کی عمل سے تہی دامنی کتنے لوگوں کی زندگی سنوار سکتی ہے: اگر ان کے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو صاف طور پر یہ بات نمایاں ہو جائے گی کہ ان میں اکثر فضول گو ہیں۔

جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعتوں کے شہسواران ممبر پر جا کر یا ذکر کا مقدس دائرہ بنا کر کتنے تشنہ کام اور جویائے حق کی مرادوں کو بر لا سکے ہیں۔ جواب ہمیشہ نفی میں ملے گا۔ میں نے بڑی بڑی جماعتوں کو دور دراز سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے شہر نوردی پر آمادہ پایا ہے۔

مگر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس ماحول کو انہوں نے چھوڑا ہے یا جس کو وہ چھوڑنا چاہتے ہیں۔ وہاں ان کی موجودگی کوئی حرکت پیدا کر سکی ہے۔ یا وہ اسلامی زندگی کے خدوخال سے آشنا ہیں۔ تو پھر اپنے گھر کو تیاگ کر دوسری منزل کی طرف تاریکی میں رُخ کرنا کون سی مصلحت ہے۔ اس کے علاوہ اسلام یہ کہتا ہے کہ امام اس کو بناؤ جس کی چوحدی تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ایسے نامعلوم لوگ جن کی زندگی کا کوئی باب ہم پر روشن نہیں ہو۔ ان کی باتیں کیسے ہم مان لیں۔ یا بغیر ان کو پرکھے ان کے مشورے ہمارے لئے کیونکر مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اصل میں بنیادی غلطی یہی ہے۔ جب تک اس کو دور نہ کیا جائے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص اپنی جگہ ایک مبلغ اعظم ہے۔ بشرطیکہ وہ اسی جگہ سے جہاں کھڑا ہے اپنی حرکتوں اور گردوپیش کے اثرات سے یہ ثابت کر سکے کہ وہ بجا ہے۔ با اصول ہے خدا کی مخلوق سے محبت کرنے والا انسان ہے اور خدا کی مرضی کے سامنے ہمیشہ جھک جانے والا ہے۔ کیا ہمارے مبلغ ایسے ہیں۔

دنیا میں سب سے آسان کام بولنا ہے مگر اس پر عمل کرنا انتہائی مشکل ہے

تقریر تو اسٹیج پر جا کر دو چار مرتبہ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر ہر شخص کر سکتا ہے مگر اس تقریر کو عملی شکل دینا یہ ہے مبلغ کا گرُ ؎

تو نظر باز نہ ایکہ تغافل نظر است
تو سخن فہم نہ ایکہ خموشی سخن است

دنیا میں ہر کام کے لئے کسی معیار کی ضرورت ہے۔ کامیاب دوکانداری کے لئے سامان کے ساتھ ساتھ دوکاندار کا بہت سی صفتوں کے ساتھ متصف ہونا بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر کے لئے باوجود تمام فنی صلاحیتوں کے ہمدرد ہونا ازبس لابدی ہے۔ اس طرح ایک ناصح کے لئے باوجود ہمہ داں ہونے کے تشخیص مرض اور اس کا صحیح علاج جو موثر، مقبول۔ اور حسب حال ہو بہت ہی اہم ہے۔

حضرت مولانا الیاس کا نام لے لے کر تبلیغی جماعتیں گھروں کو چھوڑ کر جوشِ عقیدت میں پا بجولاں ہیں۔ مگر اپنا تو یہ خیال ہے کہ یہ وقت عزیز کی بربادی ہے مذہب کی بیخ کنی ہے۔ اور تاریکی میں تیر اندازی ہے۔

مولانا نے اپنے تجربات۔ اپنی ذہانت۔ اور اپنی قابلیت سے ایک خاص گروہ میں ایک خاص قلبی یا روحانی مرض کا اندازہ فرمایا۔ آپ نے ایک دوا بھی تجویز فرمائی اس کا استعمال بھی بتایا۔ اور موثر بھی ثابت ہوئی۔ آج ماحول۔ آب وہوا۔ انسانی مزاج کی تبدیلی۔ صورت حال۔ اور دوسرے تمام قرائن بدلے ہوتے ہیں۔ مگر علاج وہی ہے۔ جس کو تقدس کی بنا پر ہم نے عقیدت مندی کا رنگ دیدیا ہے۔ اس سے کامیابی کی امید رکھنا یا اس امید پر صحرا نوردی کرنا اور مسجدوں میں کیمپ بنا بنا کر لفظی جملوں سے کسی بھلائی کی توقع کی امید موہوم ہی ہے۔ آج اس دنیا میں جتنی کثرت ناصحوں کی ہے اسی قدر قلت ان روحانی معالجوں کی ہے جن کی چشمِ بینا

دلوں کو بَرما کر سارے جسم میں تہلکہ مچا دے۔ ؎

جن کی تکبیروں سے اب تک محو لذت گوش ہے
کیا وہ تکبیرِ اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

قدامت پسندی

بہ ظاہر دنیا نے بڑی ترقی کی ہے مگر اس ترقی کی بنیادیں ان ملبوں پر ہیں۔ جو عہدِ قدیم سے بنتی اور بگڑتی چلی آ رہی ہیں۔ انہیں تخریب و تعمیر سے ترقی کی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ پھر لے دے کر اگر تجزیہ کیا جائے تو کوئی چیز نئی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ہاں شکلیں نئی نظر آتی ہیں یا ان میں زمانہ کی رفتار نے تجربات کی روشنی میں کچھ اتار چڑھاؤ ضرور پیدا کر دیا ہے۔

عمارتوں کی بڑی بڑی سربلند چوٹیاں شاید بابل کے آثارِ قدیمہ سے زیادہ پرشکوہ نہیں ہیں۔ کپڑوں کی ساخت اور بناوٹ فراعنہ مصر کے ملبوسات سے زیادہ مرصع اور مکیف نہیں ہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہیں۔ تو پھر اس کے ماننے میں زیادہ قباحت نہیں ہونی چاہیئے کہ کمال اسی ابتدا کی ہے جس کے تار و پود پر یہ گلکاریاں معرضِ وجود میں آ رہی ہیں۔ روئی کے وہی دھاگے جو لاکھوں برس پہلے تھے موجودہ دور کے مشینری کارخانوں نے ان میں اگر کچھ اضافہ ہی کیا ہے تو اسے لطافت کہہ سکتے ہیں۔ عمارتوں کے لئے مٹی کی اینٹیں جس طرح پہلے پکائی جاتی تھیں آج بھی پک رہی ہیں۔ اگر رنگ و روغن کی کیمیاوی آمیزش سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں تو آثارِ قدیمہ کے اوراقِ پریشان کی جستجو سے یہ پتہ ضرور چل جاتا ہے کہ اس میدان میں بھی قدما کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں تھے۔

ہماری تہذیب شاید آخری تہذیب نہ ہوگی۔ اس سے پہلے بھی قومیں ابھریں فتوحات ہوئیں۔ تہذیبیں آئیں ٹھہریں۔ مگر امتدادِ زمانہ نے ان کو زیرِ زمیں کر دیا ایسا زیرِ زمیں کہ ان کا نام لیوا بھی صدیوں تک شاید نہ مل سکے۔ پھر جب دنیا کو فرصت ملی

کروٹیں بدلی گئیں۔ داستان گو پیدا ہوئے تو وقفہ کے دوران ان پر تحقیقیں کی گئیں قیاس آرائیاں ہوئیں۔ کڑیاں ملائی گئیں۔ تب کہیں جا کر نینوا کے کھنڈرات، موہنجوداڑو کے ویرانے، نالندہ کی اجڑی بستیاں ہم تک پہنچیں۔ اور ہم اس پر فخر کرنے کے قابل ہوئے۔ فخر اجڑی عظمتوں کا۔ فخر لوٹی ہوئی قسمتوں پر۔ فخر ان نادیدہ کارناموں پر، جو کبھی انسان نے سر انجام دیئے تھے۔

اسی کا نام حفظِ ناموسِ کہن ہے

قوموں کی زندگی کا راز اس میں مضمر ہے۔ کہ وہ قدامت پرست ہو۔ اپنی عظمت کا اس کو پتہ ہو اور اس عظمتِ رفتہ کی یاد کو وہ اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک سمجھے۔ اس میں لچک ہو سختی نہ ہو۔

سائنسی ترقی اور موجودہ تہذیب کا میں مخالف نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار کی کیا مجال۔ مگر اس کے اقرار سے ہماری عظمت کو اگر دھکا پہنچے۔ ہماری عصبیت کو اگر ٹھوکر لگے ہماری شہ رگ پر اگر ضرب کاری کا اثر ہو تو ایسے وقت میں اپنی بقا کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم یہ پڑھتے رہیں۔ ع

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن

زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

اگر اقرار کرنے میں بھی لاشعوری طور پر ہم عظمتِ رفتہ سے گریز نہیں کر سکتے۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو دہرانے کی کوشش میں لگ جائیں۔ قومیں زندہ ہیں۔ ماضی پر۔ زندہ ہیں۔ ان اقدار پر جسے اسلاف نے اپنے خون سے سینچا اور پروان چڑھایا ہے اور انہی اقدار کی ایک کڑی ہے۔ وقت کے ساتھ چلنا۔

وقت کے ساتھ چلنا مستقبل کی طرف شاندار ماضی کی روشنی میں بڑھنا ہی زندگی کا ثبوت ہے۔ قوم کی مثال ایک بڑھتے ہوئے دریا کی ہے جو آگے کی طرف

نہایت ہی زور شور سے رواں دواں ہے۔ مگر اوپر سے بھی وہ تسلسل کے ساتھ آرہا ہے جہاں یہ تسلسل کٹ گیا۔ یا اس تسلسل کے کسی ایک نقطہ پر ٹھیراؤ ہوا تو وہ دریا کی عظمت کو عدم میں ملا دینے کے لئے کافی ہے۔

قوموں کی زندگی میں بھی روانی ہے۔ تسلسل ہے۔ ماضی پر فخر ہے۔ مد و جزر ہے اتار چڑھاؤ ہے۔ عظمتوں کے گزر جانے کے نشانات ہیں جو اپنی تہی دامنی میں بھی ہر طغیانی کو اپنے دامن میں اسی گزرگاہ سے محفوظ لے جانے کے لئے آمادہ ہے قوم دریا کی سطح ہے اس کی زندگی اسی میں ہے کہ سطح خشک نہ ہو۔ پانی آتا رہے اور کہیں سے آئے جب اس سطح پر پہنچے گا تو وہ دریا ہی کے نام سے منسوب ہوگا۔ کیونکہ نشانات باوجود اپنی کج رفتاریوں کے دریا کی بنیادیں ہیں۔ خشکی اس کی موت نہیں ہے بلکہ پانی کے بہاؤ کے نشانات یعنی سطح دریا کا معدوم ہو جانا۔ یہ موت ہے۔ اسی طرح قوموں کا عروج و زوال ہے۔ دنیا میں کون ہے جس کو ثبات ہو۔ مگر زوال کے دور میں قومی خصائص کا باقی رہنا اس پر فخر و مباہات کرنا یہ بھی زندگی کی علامت ہے۔ اسی کا نام ہے قدامت پرستی۔ ہر وہ قوم زندہ رہنے کا حق رکھتی ہے جو قدامت پرست ہو۔

زندہ قومیں قدامت پرست ہی ہیں

پیریٹی
PARITY

"میں نے اپنی سلطنت کی بنیاد دینِ اسلام کے آئین اور قوانین پر رکھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ جس قوم کی بنیاد کسی قسم کی تنظیم، نظم وضبط اور آئین پر مبنی نہ ہو وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔"

تیمور

"جس قوم کے پاس ایٹم نہیں ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ مگر وہ قوم جس کے پاس کوئی نظریہ نہ ہو وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔"

جنرل مونٹ گومری

●

پاکستان معرضِ وجود میں نظریاتی دباؤ لئے ہوئے دھماکے کے ساتھ اُبھرا۔ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے۔ وہ علاقے جو مسلمانوں کی اکثریت والے ہیں ہندوستان سے الگ ہوکر آزاد و خود مختار حکومت بنائیں۔ ہندو بقیہ ہندوستان پر حکومت کریں۔

اصول تو مان لیا۔ ملک تقسیم کر دیا گیا۔ مگر ریشہ دوانیوں، مکاریوں سے پنجاب بنگال بھی منقسم ہوگیا۔ ہندوستان کے وہ علاقے جن میں کہیں کہیں مسلمان اکثریت میں تھے اس پر یہ فیصلہ نافذ کیا نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ ہندو انگریز اس کے خلاف تھے۔

اب یہ علیحدہ بحث ہے کہ تقسیم سے کیا بنا۔ مگر یہ یقینی امر ہے کہ تقسیم ایک نظریہ کے تحت ہوا۔ وہ نظریہ ہی تقسیم کو بچا کر رکھ سکتا ہے۔ اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ پاکستان کے دو بالکل علیحدہ حصے نظریہ کے بل بوتے پر زندہ شاداب۔ بھرپور زندگی سے مملو رواں دواں

رہ سکتے ہیں۔ حصولِ پاکستان بیسویں صدی کا ایک معجزہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یا اس صدی کا سب سے بڑا دھوکا۔ آئندہ آنے والی نسلیں نہ ہمیں کبھی معاف کریں گی اور نہ بے لاگ مؤرخ کا قلم کبھی ہمیں چھوڑ سکے گا۔

وہ نظریہ کیا تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو متحد کر کے عظیم قربانی پر آمادہ کیا بڑی سے بڑی لالچ۔ قتل و خوں ریزی۔ گھروں کی تباہ کاری۔ وطن سے اخراج۔ کوئی چیز برصغیر کے مسلمانوں کو اپنے عزم سے ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ساری قربانیاں ان غریب مسلمانوں کی قسمت میں آئیں جو ہندوستان ہی میں مزید مصوبتوں، ذلتوں کے لئے چھوٹ گئے۔

آئیے اب ہم جائزہ لیں کہ آیا وہ نظریہ جس پر ہماری زندگی کا دار و مدار ہے اور جو ہماری مملکت کی بنیاد ہے۔ کیا اس کی عمارت صحیح خدوخال پر تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ انتہائی افسوسناک حقیقت ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں۔ جس پر برصغیر کی دو قومیت کی جان ہے۔ افسوس ہے کہ پاکستان میں پاکستانی قوم ہی نے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھدی ہیں۔ یہاں ہم بہ بانگِ دہل کہہ رہے ہیں کہ ہماری قومیت مذہب پر نہیں ہے۔ بلکہ علاقائیت پر قائم ہیں۔ ہم پاکستانی نہیں ہیں۔ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ ہم بنگالی ہیں۔ ہم پنجابی ہیں۔ ہم مغربی پاکستانی ہیں۔ یہ ہندوستان سے جو نکالے ہوئے مسلمان، مسلمان ہونے کی وجہ سے نکلے ہوئے آرہے ہیں وہ بہاری ہیں۔ ان ہندوستانی ہیں۔ ان کا اسلام پاکستان کی سرحد میں داخلہ کے ساتھ ہی ساتھ کافور ہو گیا۔

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

دوسرا ستون زبان کا مسئلہ تھا۔ اس کا اندازہ بس اسی سے کیجئے کہ ابھی حال ہی میں گزشتہ مہینہ صدرِ مملکت نے عدالتِ عالیہ میں مشرقی پاکستان کی وسیع و شاندار عمارت کا افتتاح ڈھاکہ میں کیا۔ جہاں سے بلا کم و کاست عدل و انصاف کے چشمے

پھوٹتے رہیں گے۔ بلا تفریق ملت و مذہب۔ شخصیت و جماعت اسی سرچشمے سے ہر شخص انصاف کی امید لے کر اس کے آستانہ کی جبہ سائی کرے گا۔ وہاں جو زبان استعمال کی گئی وہ اس بات کا مذاق اڑا رہی ہے کہ یہاں انصاف نہیں ہو سکتا۔ اس کی پیشانی پر وہ کتبہ ہے جس کو حصولِ پاکستان کے نظریہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ وہ کتبہ اِن بے گناہ مرنے والوں کا مذاق اڑا رہا ہے کہ تمہاری خوں ریزی غیر منقسم ہندوستان میں جس اصول کے لئے ہوئی تھی وہ نہیں ہوا۔

۱۹۴۸ء میں بانی پاکستان کا وہ اعلان جو انہوں نے ڈھاکہ کے جلسۂ عام میں پوری دیانت داری، استقامت اور صاف گوئی سے کہا تھا۔ اس کو وہ عدالتِ عالیہ کا کتبہ جھٹلا رہا ہے کہ تمہارا نظریہ غلط تھا۔ تمہاری قومی زبان کو اتنا حق بھی نہیں پہنچتا کہ اس کو ثانوی حیثیت بھی دی جا سکے۔

اس پر لطف کی بات یہ ہے کہ یہی پاکستان کے خود ساختہ حکام ہندوستان پر ہمیشہ یہ کہہ کر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں کہ ہندوستان نے نظریہ پاکستان کو دل سے قبول ہی نہیں کیا ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان نے تقسیم کو عملی شکل بھی دے دیا۔ خود پاکستانی اس بنیاد پر قائم نہیں رہنا چاہتے۔ ان کے سامنے حصولِ پاکستان کا مقصد چند ملازمتوں۔ لائسنسوں، پرمٹوں کے مل جانے ہی کا نام ہے۔ اس کے سوا بظاہر تو کوئی موقف نظر نہیں آتا۔ انہی ملازمتوں کے حصول کا دوسرا نام Parity ہے جہاں یہ بات غلط طور پر مان لی گئی ہے کہ مغربی پاکستان ایک یونٹ ہے مشرقی پاکستان دوسرا یونٹ۔ آسامیاں۔ لائسنس۔ پرمٹیں۔ دو مساوی حصوں میں ملیں گی۔ اور یہ اہلیت یا نا اہلیت پر نہیں بٹیں گی۔ بلکہ بنگالیت۔ پنجابیت۔ پٹھانیت وغیرہ وغیرہ کے کھوکھلے دعووں پر ملا کریں گی۔ لائق مسلمان کو کوئی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ نالائق بنگالی۔ پنجابی وغیرہ وغیرہ کو ترجیح دی جائے گی۔

بدیں عقل و دانش بباید گریست

Parity کا بھوت اتنا سوار ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں اسی چکر میں مغربی پاکستان والوں کو چھ مہینے سال میں اپنا قبلہ بھی مشرق کی طرف نہ کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

انصاف کا تقاضہ ہے کہ آبادی کی بناء پر تقسیم وسائل ہوں۔ انصاف کہتا ہے کہ اہلیت کی بناء پر ملک کی آبادی مستفیض ہوتی رہے۔ عقل کہتی ہے کہ ہر شخص کو مساوی مواقع فراہم ہوں۔ جمہوریت کا دعویٰ ہے کہ کوئی شخص اس بناء پر محروم نہیں کیا جاسکتا کہ اتفاقی طور پر وہ ندی کے اِس پار یا اُس پار پیدا ہو گیا ہو۔

یہ سب مسلمہ حربے ہیں جن کے صحیح استعمال سے صحیح افراد کا انتخاب ہو سکے گا۔ صحیح طور پر دولت تقسیم ہو سکے گی۔ صحیح ہاتھوں میں طاقت و دولت جا سکے گی۔ اس میں کسی طرح کی بددیانتی یا عیاری یقیناً بربادی کا پیش خیمہ ہو گی جس سے بچنا انتہائی مشکل امر ہے۔ اور ظلم کسی شکل میں ہو۔ کسی نقطۂ نظر سے کتنا ہی کھینچ تان کیا جائے کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ ظلم کا انجام ہلاکت و تباہی ہوا ہے۔

تیمور کے پیر مرشد کا قول کتنا سچا ہے جو انہوں نے تیمور کو بطور نصیحت پیش کیا تھا۔

"قومیں کفر سے نہیں برباد ہوتی ہیں۔ بلکہ ظلم سے ڈوب جاتی ہیں"۔

اسلامی ملک کی بنیاد بالکل اسلامی نظریہ حیات پر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس کا وجود ہی اسی نظریہ پر منصہ شہود میں آیا ہے۔ اس میں تھوڑی سی کوتاہی تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ ہندوستان کا بٹوارہ صرف ہندوؤں کی عدم رواداری کا مرہونِ منت ہے۔ عدم رواداری ہمیشہ صحیح فیصلہ سے روکتی ہے۔ سوچنے کی صلاحیت کو سلب کر لیتی ہے۔ کسی مسئلہ پر عدم رواداری کا اظہار

اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مستقبل تابندہ و درخشاں نہیں ہو سکتا۔ پاکستانیوں کو خوب سوچنا چاہیئے کہ تقسیم کوئی حادثہ نہیں تھا جو اتفاقی طور پر وجود میں آگیا۔ یا وجود میں آنے کے بعد یہ کوئی ذاتِ قدیم نہیں ہے کہ اس کو فنا نہیں۔ البتہ ان کو فنا سے بچانے کے لیئے ان زرین اصولوں پر بڑی مستعدی سے عمل ہونا پڑے گا۔ جس سے قومیں زندہ رہتی ہیں۔

جس وقت پاکستان کی جنگ لڑی جارہی تھی ہم نے سارے مسلمانانِ برصغیر سے اس کی اپیل کی تھی۔ مقصد بیان کیا تھا۔ ثقافت۔ مذہب۔ زبان کے تحفظ کا یقین دلایا تھا۔ ان سے قربانیاں لی گیئں تھیں۔ لاکھوں بے گور و کفن کھیتوں میں جزو خاک بن گئے۔ ان کی روحیں ہمیں دیکھ رہی ہیں کہ کیا وعدے پورے ہوئے جن پر ہم نے جانیں قربان کر دیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے میرا یقین ہے کہ قوم دھوکہ دیکر کبھی سرخرو نہیں ہو سکتی۔ پاکستان پائندہ باد کہہ کر نہ یہ پائندہ رہ سکتا ہے اور نہ وہ وعدے پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے اب تک ہم نے کچھ نہیں کیا اور مرنے والوں نے سب کچھ کر دکھایا۔ یہ خود اپنے اوپر ظلم ہوگا۔ اگر ہم یہ سوچ کر خود فراموشی اختیار کر لیں۔ کہ اب وہ نہیں جس کا وعدہ تھا۔ اب یہ ہے جو ہمارے مفاد کے حق میں اچھا نظر آتا ہے۔ ہاں تم اپنے وعدے بدل سکتے ہو مگر خدا نے اپنا فیصلہ بدل نہیں بدلا ہے اس کا فیصلہ کبھی ٹلنے والا نہیں ہے۔

انٹرویو

مجھے اس لفظ سے نفرت ہے کیونکہ اس کے مفہوم میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اکثر دو غیر متوازن شخصیتوں کے ملاپ کا ہے۔ ایک وہ جو انٹرویو حاصل کرتا ہے دوسرا وہ جو کرسی پر بیٹھا آنے والوں کو حقارت کی عینک سے دیکھتا ہے۔ عموماً یہ افسروں کی ملکیت ہے۔ اور بلا شرکت غیرے وہی اپنے کو اس کا جائز ولی عہد سمجھتے ہیں۔

افسروں سے ملنا بھی ایک مرحلہ ہے اس کو سَر کہنا ہر شخص کا کام نہیں اس کے لئے ڈھنگ چاہیئے۔ تجربے ہوں اور موجودہ اصطلاح میں ٹیکٹ Tact کی ضرورت ہے۔

جس کرسی پر افسر جلوہ افروز ہوتا ہے اس کی حفاظت باہر سے ایک اَرڈلی (پیون) کرتا ہے۔ جس کو ایک سگریٹ اور چند پیسوں میں خوش کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس خوش کرنے کا راز معلوم ہے تو انٹرویو بہت جلد خریدی جا سکتی ہے ورنہ گھنٹوں بیٹھئے۔ کیونکہ یہ خریداری خودداری کے خلاف ہے۔ ایک معزز شخص کے لئے یہ کیونکر گوارہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا ضمیر اس طرح کچل دے۔

یہ تو ہوا پہلا مرحلہ اس میں اگر عشق سے کام لیا گیا۔ یعنی (حصولِ انٹرویو کی تمنا کا عشق) تو فبہا ورنہ تاخیر تو لابدی ہے۔ دوسرا زینہ "بڑا صاحب" کا موڈ ہے میں نے بارہا گھنٹوں اس تمنا میں درِ جاناں پر بیٹھ کر فراق کی کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے۔ بڑا صاحب کو تہی دستان قسمت کے آنے کی خبر کے باوجود یہ احساسِ کمتری ستائے رہتی ہے کہ آنے والا ہماری عظمت کا قائل شاید نہیں ہے

اس عظمت کو جتانے کے لئے وہ اپنی اہمیت اور مشغولیت کا رعب عالمِ فراق سے دینا چاہتا ہے۔ احساسِ کمتری میں افسر جتنا زیادہ دبا ہوا ہو اتنا ہی وہ حاجتمند جو چلمن کی آڑ سے تماشائی کھڑا دور کا جلوہ دیکھ رہا ہو مجبور و بے بس نظر آئے گا۔

سب سے زیادہ لطف کی بات تو یہ ہے کہ انٹرویو کا وقت باضابطہ تختی پر لکھا "درِکعبہ" کے سامنے لٹک رہا ہو۔ پھر کیا مجال جو زائرین کو یہ اجازت ہو کہ ایک قدم بھی آگے بڑھ جائیں۔

"بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔" یہ ہیں خوفناک الفاظ جو سوہانِ روح ہیں۔

مجھے دفتری ضرورتوں کے لئے صفا و مروا کے طواف کا شرف حاصل ہوا ہے کچھ ایسے بھی فرعون میں نے دیکھے ہیں جو گھنٹوں چرٹ پاتے کے بعد فضول باتوں میں وقتِ عزیز ضائع کر رہے ہوتے ہیں مگر ان کی افسریت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ وہ جس کام کے لئے متعین کئے گئے ہیں اس کو ایمانداری سے انجام دے سکیں۔

یہ عام مرض ہماری اسلامی جمہوریت میں افسروں کے ساتھ لگا ہوا ہے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں مگر یہ خال خال ہیں۔ ان بیماریوں کو دیکھنے کے بعد ہمیں حضرت عمرؓ یاد آتے ہیں آپ عامل (گورنر) اس شرط پر مقرر فرمایا کرتے جو اپنا دروازہ اہلِ حاجت کے لئے کھلا رکھے۔ یہ جمہوریت کے لئے جزوِ لانیفک ہے۔ مگر ہماری اسلامی جمہوریت کا طرۂ امتیاز اس کا فقدان ہے۔ بلا ضرورت انٹرویو کی تمنا محض دید کی خاطر انتہائی پسپائی ہے ضمیر کشی ہے اور قلب و جگر کی بربادی۔

بڑوں سے ملنے کے بعد جو ردِ عمل ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اپنی پستی کا احساس شدید تر ہو جائے۔ جتنی اونچی شخصیت سے انٹرویو کی تمنا ہو ٹھیک حصول کے بعد ہی حساس دل پستی سے جب اس بلندی کا اندازہ لگاتا ہے تو اس کا جسمِ ناتواں اپنے کو اتنا ہی نیچا محسوس ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے خودداری کو ایک ٹھیس لگتی ہے اور اپنی شخصیت کو ایک دھکا۔ اس ملاقات سے نہ ملنا بہتر ہے۔ ایسی دیدنی سے نادیدنی مبارک۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی تمنا اسی "دید" کی تھی۔ اور پھر خدا کی جلوہ فرمائی نے جو حال موسیٰ علیہ السلام کا کیا اس سے یہی بہتر تھا کہ ان کی آرزو کچھ اور ہوتی۔ علماء کا جو خیال ہو اپنا تو یہ ایمان ہے کہ حضرتِ موسیٰ کے اظہارِ شوق سے اتمامِ آرزو کا تکملہ تو ہو گیا۔ مگر ان پر جو بدحالی طاری ہوئی وہ پر کیف نہیں کہی جا سکتی۔

بڑوں سے بلا ضرورت ملنے کی خاطر ملنا نادانی ہے۔ ان سے ملنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں پڑھو۔ ان کے مضامین کا مطالعہ کرو۔ جہاں وہ اپنے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہ فرماتے نظر آئیں گے۔ ع

من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

اپنی تحریر میں وہ صاف گو۔ سادہ۔ خالی از تصنع۔ اور بڑا پا کے ہر اس ہتھیار سے مسلح دکھائی دیں گے۔ جس کے وہ واقعی اہل ہیں۔ ہم ان کی کتابوں سے سب کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مگر ان کی ملاقات سے سوائے ندامت اور ٹھوکر کے دوسری چیز ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی۔ بدقسمتی سے کچھ ایسے بھی بڑے ہو گئے ہیں جو اس کے مستحق نہیں ہیں۔ مگر گردشِ دوراں نے انھیں اس طوقِ زریں سے نوازا ہے۔ ان سے کسی حال میں بھی ملنا خالی از قباحت نہیں۔ ملنے سے پہلے اور بعد سوائے الجھن اور ندامت کے کوئی چیز نہیں مل سکتی۔

ہاں اس تاریکی میں ایک دوسری نوعیت کی چمک بھی موجود ہے وہ بزرگانِ دین کی ملاقات اور ان سے شرفِ نیاز۔ اس سے آنکھوں میں ٹھنڈک۔ قلب وجگر میں سکون اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ایک ایسی خوشی کا نہ زائل ہونے والا احساس تازیست موجزن رہتا ہے جس کی یاد باعثِ صد خیر وبرکت روح کو تڑپانے والی اور دلِ مضطر میں ایسی جنبش پیدا کرنے والی جسے وہی سمجھے جس کی آنکھوں نے قربت حاصل کر کے جلوۂ کبریائی کا نظارہ دیکھا ہو۔ ؎

دربارِ شہنشہی سے خوشتر

مردانِ خدا کا آستانہ

ان کے دربار میں حاجب کی ضرورت نہیں۔ ان کے دروازوں کے دونوں پلّے ہر آنے والے کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ جہاں پہنچکر دنیاوی تفرقے اونچ نیچ کا غلط اندازِ تفکّر ختم ہو جاتا ہے۔ بوریا نشینی کا اثر شہنشاہ وگدا کو اپنی شخصیت کے بھول جانے پر مجبور کرتا ہے اور ہر دیکھنے والا یہ کہتا ہوا نکلتا ہے ؎

آفاقہا گردیدہ ام، مہرِ بتاں ورزیدہ ام

بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

یہاں شخصیت بنتی ہے بگڑتی نہیں ہے۔ ایسی ملاقات اور انٹرویو کی تڑپ خدا ہر شخص کو بخشے۔ ؎

تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری

مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

ان بزرگانِ دین کے دروازے ساری زندگی کھلے رہے اور بعد از وصال بھی ہر کہ ومہ کے لئے بلا روک ٹوک کھلے ہیں برخلاف ان کے دنیاوی کروفر رکھنے والی شخصیتیں مثلاً سلاطین وعمائدین وقت جن سے ان کی زندگی میں ملنا کارے دارد تھا وہاں انہی

لوگوں کی گزرتھی جو خود غرضی، خوشامد، ضمیر فروشی کے ہتھیاروں سے مسلح تھے ان کے مرنے کے بعد ان کی قبروں پر نہ کوئی ہجوم ہے اور نہ کوئی کشش۔ ہمایوں کا مقبرہ اپنی بے کسی پر نوحہ خواں ہے۔ بادشاہوں کی مدفون لاشیں آنے والوں کے لئے چشم براہ ہیں مگر کون جائے زندگی میں انہوں نے آنے والوں کو روکے رکھا۔ مرنے کے بعد کون ہے جو انھیں کلماتِ خیر سے نوازے۔ ان کے مقبروں کے کھلے ہوئے دروازے گزرنے والوں کو حسرت سے دیکھ رہے ہیں۔

برٹرینڈ رسل

Bertrand Russl

حساب دان۔ فلسفی۔ ادیب۔ مفکرؔ۔ آزاد خیال رسل سوموار کے دن ۲ فروری ۱۹۷۰ء کو اپنی قیام گاہ پر ۹۷ سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد اس دنیا سے چل بسا اس نے بھرپور۔ زنگارنگ۔ صاف۔ پرکیف۔ ہنگامہ خیز۔ طوفانی زندگی گزاری۔ شہرت تو پیدائشی طور پر خاندان سے ورثہ میں ملی۔ درد مند دل انسانی محبت سے لبریز۔ انسانیت کے مستقبل پر نوحہ کناں۔ امن کا مجاہد اعظم۔ جنگ کے خلاف سینہ سپر۔ عظیم مفکرؔ پرزور قلم کا مالک۔ پیاری شخصیت کا پیکرِ مجسم۔ ایٹم کے خلاف دنیا سے برسرِ پیکار شاید اب کوئی دوسرا سالارِ کارواں نہ آئے۔

اس نے خیالات کو فکر کی گہرائی بخشی۔ ہمیشہ انسانیت کے تحفظ کے لئے جنگ آزما رہا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم میں بھی وہ جنگ کے خلاف رہا۔ اپنے اسی شدید فکری اختلافات کی بنا پر جیل کی تاریک کوٹھری میں بھی جانا گوارہ کیا۔ جہاں اس نے سکون سے رہ کر اپنی شہرۂ آفاق کتاب — Introductions to Mathematical Phillosphy — لکھا۔

ویت نام کی جنگ کا بھی وہ شدید مخالف رہا۔ امریکہ کے صدر جونسن پر اس نے خود ساختہ اخلاقی عدالت میں مقدمہ چلایا اور ان کو سزا دلائی۔ نوے سال میں جوانوں کی طرح بے باک نڈر جوہری ہتھیاروں پر پابندی لگانے کے سلسلے میں مظاہروں کی قیادت کی۔ اس بات کی ضرور غمازی کرتے ہیں کہ خدا نے اس کو ایسا بے قرار دل دیا تھا۔ جس کو سارے جہاں کا درد ہمیشہ مضطرب بنائے رکھتا تھا۔ اس کی موت سے

اس کی زندگی تکمیل کو تو پہنچ گئی مگر دنیا ایسے پر آشوب دور میں ایک مخلص بہادر شخص کو کھو بیٹھی جس کا ثانی شاید دنیا میں کوئی دوسرا صدیوں پیدا نہ ہو سکے۔

آئندہ اچھے معمار۔ کاری گر۔ ٹیکنیکل اشخاص پیدا ہوں گے۔ مگر رسل جیسی شخصیت کے لئے جنہوں نے خیالات میں بالیدگی۔ فکر میں گہرائی بخشی ہے۔ شاید انگلینڈ جیسے مردم خیز سرزمین کو بھی انتظار میں صدیاں نہ گزارنی پڑیں۔

برٹرینڈ رسل اب نہیں ہے۔ اس کا بچپن۔ جوانی طویل آ کر نہ جانے والا بڑھاپا۔ پھر موت یہی تو زندگی کے ایام اور داستان کے عنوانات ہیں۔ اس نے ہر ایک سے کام لیا۔ موت نے اس سے کام لیا۔ زندگی مکمل ہوئی۔ مگر اس نے اپنی زندگی سے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔

اس کے خیالات سے ہم آہنگی ہو یا نہ ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ اس نے جو کچھ کہا یقین کے ساتھ نڈر ہو کر کہا۔ گرچہ اس کی قیمت بھی اس نے ادا کی۔ کبھی جیل جانا پڑا۔ کبھی ملازمت سے نکال دیا۔ کبھی اس کو لادین کہہ کر مردود بتایا گیا۔ کوئی چیز اس کے اٹل سوچنے کے طریقے میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ پیدا کر سکی وہ اپنے خیالات کی شدت میں جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ مگر اس کا ہر قدم جچا تلا ہوا تھا۔

یہ کس مقام پہ لایا جنوں خدا جانے
سنبھل سنبھل کے قدم رکھ رہے ہیں دیوانے

رسل کی خود نوشتہ سوانح حیات موجود ہے۔ یہ ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی ہے۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ یہ سوانح ان کی موت کے بعد طبع ہو۔ مگر اس کے شائع کرنے والوں کے اصرار پر ان کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ اس لئے موت جو زندگی کا جزو ہے وہ شمولیت سے نکل گئی ہے۔ اب سوالات کئے جا سکتے ہیں کہ مصنف نے آخری

لمحات کس طرح گزارے. کیا وہ اپنے خالق حقیقی سے ملنے یا اتھاہ تاریکی میں جانے کے لئے تیار تھے. کیسے موت کو اس نے لبیک کہا. فاتحانہ تبسم یا شکست خوردگی کا تھکا دینے والا احساس. ان آخری لمحات میں اس نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا. اضافہ کا متقاضی ہے۔

مجھے امید ہے کہ دوسری طباعت میں ان کے قریب ترین ساتھی اس پر ضرور تبصرہ کریں گے۔

رسل کو ہمیشہ جنگ سے نفرت تھی. اس نے وہ زمانہ بھی دیکھا. جب برطانیہ کے اقبال کا آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا تھا. برطانیہ کی عظمت اس کی شہنشائیت یورپ سے ہندوستان تک مقبوضہ علاقہ راستوں پر تسلط. انگریز قوم کو غرور کی حد تک برباد کر چکے تھے. مگر اس دور میں بھی وہ امن ہی کا پجاری رہا. آخری دنوں میں سب سے بڑا خطرہ اس کو ایٹم کے استعمال سے رہا جس کی اس نے کھل کر مخالفت کی. اس کی یہ پیشین گوئی خدا کرے کبھی سچ نہ ہو.

"دنیا کی تباہی ایٹم کے استعمال سے یقینی ہے۔"

اس کی مشہور کتاب UNPOPULAR ESSAYS میں ان حقائق کو بیان کیا ہے جو اس وقت کی بے راہ رونسل سننے کے لئے تیار نہیں ہے. اسی لئے غیر مقبول کا نام دیا ہے۔

ڈزرائلی. گلیڈسٹون. برنارڈ شا. ایچ جی ویلیس. چرچل. برٹرنڈ رسل. جس قوم میں یہ یک وقت پیدا ہوں. ممکن ہے اس دور انحطاط میں بھی اس قوم کا سہارا دینے والا کوئی ابھر رہا ہو. مگر میری قوم میں سر سید. محمد علی. محمود الحسن. علامہ اقبال جناح کے بعد آنکھیں پتھرا گئی ہیں. اس کی زندگی مجاہدانہ گزری. اس اسلحہ سازی اور ایٹم کے دور میں اس کا سامان جنگ قلم اور صرف قلم رہا. اپنے خیالات کو

عملی جامہ پہنانا قلم ہی کے ذریعے اس نے اختیار کیا۔ اس کے سوچ کا طریقہ اچھوتا تھا۔ دکھی انسانیت کا درد اس کا سرمایہ حیات تھا۔

اس کی شدت سے بے تاب ہو کر قلم کی مدد سے اس نے خیالات کو انڈیلا۔ اور دنیا نے اس کی مخلصانہ اپیلوں کو کبھی ناقابل توجہ نہیں سمجھا۔ وہ آج نہیں ہے مگر اس کے مفکرانہ وزنی اعتقادات ہمیں ہمیشہ بے چین کرتے رہیں گے۔

اس کا دماغ ملحد تھا مگر قلب مومن۔

خان عبدالغفار خان (سرحدی گاندھی)

میں نے کبھی خان عبدالغفار خاں کی پالیسیوں کو محترم نہیں سمجھا۔ نہ کبھی عقیدت کا کوئی جذبہ ان کی طرف سے اپنے دل میں پیدا ہوا۔ تقسیم ہند کے پہلے خان برادران کا رویہ ہمیشہ منفی رہا۔ مسلمانوں کے جذبات سے کبھی یہ قریب نہ ہوسکے۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ بڑا ہی سنگین ہوتا گیا۔ کانگریس کے ہائی کمانڈ کے حکم کی تعمیل۔ ان کو صحیح حالات سے بے خبر رکھنے کی سعی لاحاصل۔ پختونستان کا فرسودہ ڈھونگ۔ نہرو کا صوبہ سرحد میں شاہانہ ورود پھر ان پر افسوسناک حملہ۔ یہ ساری باتیں انہی خان برادران کی ناعاقبت اندیشی سے پیچیدگیوں میں اضافہ کرتی رہیں۔

ہندو مسلمان ہندوستان کے باشندے ہیں۔ دونوں کو ساتھ ہی رہنا ہے۔ تقسیم سے بھی یہ مسائل حل نہ ہوسکے۔ بلکہ ہر آنے والا دن اپنی نوعیت کے اعتبار سے لاتعداد مسائل اپنے دامن میں لاتا ہے جو بغیر حل رہ جاتے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم پر کانگریس اس لئے راضی ہوئی تھی کہ مسلم لیگی سیاست سے نجات مل جائے گی۔ مگر مسلمانوں سے نجات اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ سارے مسلمان یا تو ہندوستان سے نکال نہ دیئے جائیں یا تہ تیغ نہ کر دیئے جائیں۔ یا یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ان دونوں صورتوں پر عمل درآمد اس بیسویں صدی میں ناممکن ہے اس لئے انہیں ایک برائی کے طور پر ہی قبول کر لیا جائے۔ ایسی صورت میں وہاں کے مسلمانوں پر یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ وہ بھی اپنے رویّہ میں تبدیلی پیدا کریں اور اس بات کا کھل کر اعلان کر دیں کہ تقسیم میں ہم شریک نہیں تھے۔ اس سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوئے۔

مگر ہر روز کی قتل و غارت گری۔ فرقہ وارانہ فسادات۔ ابھی احمد آباد میں ستمبر ۱۹۶۹ء کے خونی واقعات سے کیا ہندوستان کی وہ تصویر جو گاندھی جی نے عدم تشدّد پر کھڑی کی تھی محفوظ ہے۔ محفوظ تو خیر پہلے بھی نہیں تھی۔ خود گاندھی جی کا قتل ان کے عدم تشدد کی تہی دامنی پر نوحہ کن ہے۔ کیونکہ جس زمین میں یہ خوبصورت بیج وہ بوتے رہے۔ وہ اس کی افادیت کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی یا نہیں۔ تقسیم کے بعد کے واقعات ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ زمین شور تھی اس لئے اس کے پروان چڑھنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔

ابھی غفار خان صاحب جو سرحدی گاندھی کے پیارے لقب سے بھی یاد کئے جاتے ہیں گاندھی جی کی صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں ہندوستان میں مدعو ہیں۔ آتے ہی فرقہ واریت کے خوفناک دلدل میں اپنے کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی موجودگی کی ساعت سعید کو بھی ظالموں نے بھیانک خوں ریزیوں نے اتنا گھناؤنا کر دیا ہے کہ ان کو لال قلعہ دہلی کی تقریب میں جو دہلی کے شہر باشیوں نے منعقد کی تھی کہنا پڑا کہ تبدیلیاں آنے والی ہیں اگر تم (ہندوستان کے رہنے والے) نہیں بدلے تو تاریخ اپنا فیصلہ نہیں روک سکتی۔ فیصلہ جلد ہو گا اور ضرور ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ اگست ۱۹۴۷ء میں مکمل طور پر بدلی ہوئی نہیں سمجھنی چاہیئے۔ یہ انگریزوں کے چلے جانے کے فیصلہ سے خلاء میں ایک دھماکہ تھا۔ مگر اب جو تبدیلی ہو گی وہ عوام الناس کی برسہا برس کی تلخ کامیوں کے ردعمل سے پیدا ہو گی۔ جہاں جذبات۔ تعصب۔ فرقہ پرستی جیسے عناصر کی جگہ حقیقت پسندی۔ محبّت۔ انسانی برادری کے اثرات زیادہ گہرے۔ دوررس اور فیصلہ کن ہوں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرحدی گاندھی کی موجودگی مسلمانان ہند کے لئے

تقویت کا باعث بن سکتی ہے۔ ایسے آڑے وقت میں امید کی کرن کسی جانب سے نمودار ہو باعثِ صد انبساط ہے۔

شیخ عبداللہ۔ عبدالغفار خان جیسے بیباک نڈر لیڈر جس قوم میں ہوں اس کے لئے یہ نیک شگون سمجھنا چاہیئے۔ شیخ عبداللہ نے تو حقیقت پسندی کا ثبوت اس وقت دیا جب حالات ان کی گرفت سے باہر ہو چکے تھے۔ ہندوؤں نے ان سے اس وقت تک کام لیا جب تک وہ ان کے کام آ سکے۔ نہرو کے سارے وعدے، اقوامِ متحدہ میں ساری تجاویز دھری کی دھری رہ گئیں۔ کیونکہ شیخ عبداللہ ہندوستان کے ترازو پر بیٹھ کر توازن بگاڑ چکے تھے۔

مگر اِن نا امیدیوں۔ پسپائیوں۔ ہزیمتوں سے گزر کر ہی تو انسان، انسان بنتا ہے شاید ہی برصغیر میں کوئی شخص عبداللہ جیسا داغدار اور صابر ہو۔ ہندوستان سے دوستی راس نہ آئی۔ اب دشمنی کے ایام ہیں۔ شخصِ واحد قومی تحریک میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا اصول۔ صداقت۔ ایثار اور بے لوث خدمات کی چٹانوں پر اس کی حیثیت ادارہ کی ہو جاتی ہے مگر ادارہ کا مفہوم ہمیشہ جماعت ہی رہا ہے۔ اب شیخ عبداللہ پختہ کار ہیں۔ قید و بند کی صعوبتوں نے ان کو بہت ہی بلند کر دیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہندوستان خود فریبی میں وقت کو ٹالتا رہے۔ مگر حالات اس کی گرفت سے باہر ہیں۔ وقت کی رفتار تیز ہے۔ کشمیر۔ نیز ہندوستان کے مسلمانوں کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔ یہ کوئی بیرونی طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ خود ان کے اپنے غیر عملی اقدام پر مبنی ہے۔

جس طرح ہندوستان میں مسلمان پریشان ہیں اسی طرح پاکستان میں بھی ہندوستان سے آنے والے مسلمان اپنے مستقبل سے خائف و لرزاں ہیں۔ کیونکہ بدقسمتی سے صحیح قیادت کا فقدان ہے جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان میں ہے۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمان جو پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ اِن بیس سالہ ایام میں اس متاعِ گراں سے تہی دامن

رہے ہیں۔ قوموں کا مؤثر وجود اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے۔ جب قیادت شروع ہی سے زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہو۔ مثلاً تعلیم ونظامِ نظریہ۔ حفظانِ صحت، تجارت جذبہ ایثار و قربانی۔ مذہب۔ اخلاق۔ اقدار۔ تعمیر۔ ثقافت۔ غرض اس پیچیدہ دور میں ہر ہر قدم پر دور اندیشی۔ صحیح نشوونما۔ اصولِ زندگی پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کی صلاحیت، اہم ترین شرائط ہیں۔

تقسیم کے بعد جو مہاجرین کا طوفان پاکستان آیا وہ حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے وطن کو تیاگ دینے پر بادلِ ناخواستہ تھا۔ نہ ان کی رہائش کا بندوبست ہو سکا۔ نہ ان کی گوناگوں دشواریوں کا جائزہ لیا جا سکا۔

تقسیمِ ملک تو باہم تینوں فریقوں۔ کانگریس۔ برٹش حکومت اور مسلم لیگ کی باہم رضامندی سے معرضِ وجود میں آیا۔ مگر سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اتنے آدمی ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں دھکیل دیئے گئے کہ نوزائیدہ مملکت پاکستان افراتفری کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ تو سخت جانی ہی تھی کہ باوجود دشواریوں کے کھڑا رہ سکا۔ ظاہر ہے ہندوستان میں عبدالغفار خاں جیسے رہنما۔ یا شیخ عبداللہ جیسے قائد کا قیام مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ سے کم نہیں تھا۔ مسلم لیگی قیادت کا وجود ہندوستان میں ناپید تھا۔ اگر ہوتا بھی تو وہ صدائے صحرا یا تقسیم کے گناہوں سے بوجھل ہوتا۔ ہندوستان نے نہ اس کو تسلیم کیا اور نہ خود بچے ہوئے رہنماؤں ہی میں یہ صلاحیت تھی کہ شکست خوردگی جو ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمت میں آچکی تھی اس سے وہ احساسِ کمتری کو کم کر سکتے تھے۔

اب لے دے کر ایک سہارا تھا کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بصد آب و تاب قائم ہو چکا ہے۔ مگر اس کی قیادت جناح صاحب کی وفات سے مفلوج ہو گئی۔ پھر لیاقت علی خان کا قتل یہ دوسرا اور آخری حادثہ تھا۔ اس کے بعد سے آج تک

کوئی مردِ عزیمت نہیں پیدا ہوا۔ جو کم از کم صحیح نظریۂ پاکستان کو باقی ہی رکھ سکتا نتیجہ فوراً ہی رونما ہونے لگا۔

ہمہ گیریت نے علاقائیت کا روپ دھار لیا۔ زبان محفوظ رہ سکی نہ مذہب کو وہ اہمیت حاصل ہوئی۔ جس کی دہائی دیکر برِصغیر کے مسلمانوں کو بیوقوف بنایا گیا تھا۔ اور ہندوؤں سے اس لئے جدائی اختیار کی گئی تھی کہ مذہب کی بنیاد پر قومیت کا دارومدار ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے تقسیم ہند تک جتنے بلند بانگ دعوے۔ یقین دہانیاں۔ امیدیں وابستہ کرائی گئی تھیں۔ انفرادی اور مجموعی طور پر اِن تمام بنیادوں کو اس طرح منہدم کیا جا رہا ہے کہ بقول اقبال ؎

دبے تاویل شانِ در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

لطف کی بات تو یہ ہے کہ پاکستانی زعماء اکثر و بیشتر یہ کہتے نہیں جھجکتے :۔

"ہندوستان نے تقسیم ہند کو دل سے قبول نہیں کیا ہے اس لئے وہ دشمنِ اعظم ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان نے تقسیم کا مذاق اڑایا ہے۔ اڑا رہا ہے اور اڑاتے رہنے کے موڈ میں ہے۔ اِن حادثات کے بعد خان عبدالغفار خان کی شخصیت اپنی نوعیت کی بناء پر منفرد۔ بلند عظیم الشان ہے۔ حصولِ مقصد کی ناکامی سے مقصد کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ یہ لوگ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رابطے کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ مگر جب جب ایسے اتفاقات پیدا ہوئے حالات نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

نہرو کی زندگی میں شیخ عبداللہ کی رہائی۔ نہرو کے ایماء پر شیخ عبداللہ کا دورۂ پاکستان۔ نہرو کی موت۔ پھر نا امیدی موجود ہو گئی۔ ہندوستان پر چین کا حملہ۔

کشمیر کا مسئلہ ابھرا۔ پاکستان نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ، جنگ بندی۔ اعلانِ تاشقند۔ پھر تعطل۔

عبدالغفار خاں کا ورودِ مسعود۔ احمد آباد میں بھیانک فرقہ وارانہ فساد رباط کانفرنس سے ہندوستان کا اخراج۔

پتہ نہیں قدرت کا اس سلسلے میں کیا منشا ہے۔ کون سی قربانی وہ اس برِصغیر کے باشندوں سے لینا چاہتی ہے۔ ان ناامیدیوں کے بعد جب جب آس بندھی بدقسمتی سے وہ سراب ثابت ہوئی۔

خان عبدالغفار خاں کی موجودگی تو ہندو مسلم فسادات کے دوران احمد آباد کے مسلمانوں کے لئے باعث تقویت سمجھی جاسکتی ہے۔ مگر ڈھاکہ کے فساد بین المسلمین کا علاج کہاں ڈھونڈا جائے۔ پاربتی پور۔ کھلنا۔ چاٹگام۔ نرائن گنج میں ہندوستانی مسلمانوں پر جو قیامت ڈھائی گئی۔ اب کون عدم تشدد کے دیوتا کو ندا دے۔ جناح۔ لیاقت علی خاں کی روحوں کو شاید زیادہ کروٹ بدلنے کی ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ وہ ایک جگہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ مگر وہ لاکھوں بے گور و کفن لاشیں جو ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک پیوندِ زمین ہوگئیں۔ پاکستانیوں کے اس تمسخر سے شاید وہ زیرِ زمین ایسی کروٹ نہ لیں۔ جو اوپر کے رہنے والوں کو زیر و زبر کردے۔

مغلوں کے زوال کے بعد برِصغیر کے مسلمانوں کی متحدہ قربانیوں کا نتیجہ پاکستان کا حصول تھا۔ وہ حاصل ہوگیا۔ مگر کیا برِصغیر کے مسلمانوں کی مشکلات کا مداوا بھی ہوا۔ ان کی قسمت میں ہندوستان میں قتل و غارت گری ہے۔ پاکستان میں بھی ان کے لئے باعزت مقام نہیں ہے۔

"قومیں کفر سے برباد نہیں ہوتیں بلکہ ظلم سے ہوتی ہیں"۔

غفار خان جیسے لوگ پٹے ہوئے مہرے ہیں۔ اب ان کی حیثیت آثارِ قدیمہ جیسی ہے۔ ہندوستان میں وہ اجنبی ہیں۔ پاکستان میں غدار۔ نظریۂ پاکستان کی دھجیاں اڑانے والے پاکستانی ہیں۔ نظریہ پاکستان پر مر مٹنے والے قدامت پرست بے وقوفوں کے جنت کے باشی۔

پاکستان پائندہ باد

آج پاکستانی رہنما رباط کانفرنس سے ہندوستان کے اخراج پر بغلیں بجا رہے ہیں۔ اپنی کامیابیوں کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ مگر کیا اس سے ہندوستانی مسلمانوں کا دکھ درد کم ہوا۔ کیا ان کے حفاظت کی گارنٹی مل گئی۔ کیا زعمار ملت ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب سے دل آزردہ اور دکھی ہیں۔ ان کی نیندیں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ ذرا بھی کبیدہ خاطر نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ نہ پاکستانی قوم نے کوئی احتجاج کیا اور نہ حکومت نے سوگواریت کا روپ دھار لیا۔

یہ سہرا اگر پھر بندھا ہے تو وہی خان عبدالغفار خان کے سر پر۔ اگر پریشان ہے تو وہی غدار مسلمان۔ اگر برت رکھتا ہے تو وہی ہندوؤں کی ہتھیلی پر پلنے والا کانگریسی مسلمان۔

خان عبدالغفار خان نے صاف صاف پریشان حال۔ لٹے ہوئے کیمپ میں پناہ گزین مسلمانوں سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کہا۔

"تمہاری مصیبتیں خود تمہاری تخلیق ہیں۔"

"یہودیوں کا وجود بھی اسی گناہ کی پاداش ہے۔"

احمد آباد کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو جس کے سننے کے لئے پہلے کوئی ہندوستانی مسلمان تیار نہیں تھا زہر ہلاہل سمجھ کر نوشِ جان کیا۔ کیونکہ اس سے

مفر کی صورت اب کہاں ہے۔ یہ تسکین بھی ہے جو دے۔

پاکستان بنانے والے رہنما اپنا بستر گول کر کے ہندوستان کو خیر باد کہہ کر چلتے بنے۔

البتہ اتنا کہتے ہوئے سنا گیا کہ:۔

"تم اپنے ملک کے وفادار رہو۔"

کاش ہم تقسیم ہند سے پہلے بھی یہ مشورہ سنتے تو نہ ملک تقسیم ہوتا۔ نہ یہ پناہ گیریت کا مقدس فریضہ ہی ہم انجام دیتے۔

روسی اسلحہ

قیامِ پاکستان کا اکیسواں سال ہے۔ اب تک پاکستان نے اپنی بقا کی خاطر خارجہ تعلقات کی استواری کا راز صرف یہ سمجھا تھا کہ مغربی طاقتوں سے میل رکھا جائے۔ ابتدا میں اسے اشد ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی بھی پاکستان کی مدد پر آمادہ ہو جائے۔ وہ دوست ہے۔ اس شاطرانہ سیاست کی دنیا میں طفلِ نوزائیدہ مملکت پاکستان کا وجود ہی ناقابلِ تسلیم تھا۔ انگریز اس میں زندگی کے آثار نہیں دیکھ پاتے تھے۔ ہندوستانی پنڈتوں نے ناقابلِ عمل کہہ دیا تھا۔ اس لئے سہارا کچھ انگریزوں نے دیا۔ پھر امریکہ نے فوجی اہمیت کے معاہدوں سے اس کی دیواروں کو مضبوط کیا۔ اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ اور اس مدت میں پاکستان نے زندہ رہنے کے آداب سے واقفیت حاصل کی۔ پرانے دوست آزمائش کے وقت کام نہ آسکے تو لازمی نتیجہ تھا کہ رخ پھیر کر بھی دیکھا جائے۔ چنانچہ تدریجی طور پر کروٹیں بدلی گئیں۔ روس جس نے ہندوستان کی موافقت میں بارہا حقِ تنسیخ استعمال کیا تھا اس کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ اور اب اسلحہ کی فراہمی کا اس نے وعدہ بھی کر لیا ہے اس وعدے سے ہندوستان والے بوکھلائے ہوئے ہیں۔ احتجاجات ہیں نامہ و پیام ہے روس سے تلخی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ شگون نیک ہی ہے۔

روسی رویہ قابلِ توجہ ہے۔ روس سے قربت پاکستان کے لئے اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ہندوستان اور روس کے تعلقات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ اب لازماً ہندوستان امریکہ سے رجوع کرے گا۔ یا چین سے رشتے جوڑنے کی کوشش میں جان کی بازی لگا دے گا۔

چنانچہ اندرا گاندھی نے صاف کہہ دیا ہے کہ چین سے مذاکرات کے دروازے بند نہیں ہیں۔ اگر ہندوستان چین کی طرف جھکا تو ظاہر ہے امریکہ چونک اٹھے گا روس بھی اپنے سامانِ جنگ کا سیلاب کی طرح فراہمی پر دوبارہ غور کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گا۔ اور ہندوستان اپنی خارجہ پالیسی جو عناد پاکستان پر مبنی ہے مزید لچک پیدا کرنے کی کوشش میں بے دوست ہی رہ جانے کا کردار ادا کرے گا۔ یہ ہے نتیجہ ان غلطیوں کا جس کو ہندوستان پاکستان دشمنی کی سزا میں بھگتے گا۔

یکم دسمبر ۱۹۶۸ء

خط کا جواب

مہٹا ضلع پٹنہ سے ہمارے ایک عزیز کا دردناک خط جس کا جواب ذیل میں درج ہے۔

مضمونِ خط

مخلصم قسیم

بہت دنوں کے بعد خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ وہ بھی ضرورتاً۔ اِن دنوں ہمارے بھائیوں میں آپس میں خانہ جنگی ہے۔ لاکھ جتن کئے مگر سمجھوتے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ الٹا معاملہ اور پیچیدہ و سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ دن رات یہی سوچ ہے کہ کسی طرح حالات رُخ بدلیں۔ کوئی صورت پیدا ہو تلخی دور ہو۔ اخوت و محبّت کا رشتہ کسی طرح معمول پر کام کرنے لگیں ہاں ایک نقشہ دل نے بنایا ہے۔ تم آجاؤ تو امید ہے کہ ساری گتھیاں سلجھ سکیں۔ کیا آسکتے ہو؟"

رفیقؔ

جواب جو میں نے دیا حسب ذیل ہے۔

پیارے رفیق

سلام مسنون

تمہارا خط مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۶۹ء ملا۔ پڑھ کر صدمہ ہوا۔ تمہارے مناقشات سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں۔ آخر جھگڑا کس بات کا ہے۔ تمہارے پاس کوئی

جائیداد نہیں۔ کوئی دولت نہیں۔ نہ کوئی ایسی زمینداری ہی تمہارے والد چھوڑ کر گئے ہیں جس سے بھائیوں میں جنگ۔ منافرت۔ یا شکوہ شکایت کا موقع ہو سکے۔ گو میں بہت دور ہوں۔ مگر تم لوگوں کے حالات کا اندازہ بہت ہی قریب کی طرح لے سکتا ہوں اور لے رہا ہوں۔ سارا قصہ تنگ نظری کی پیداوار ہے۔ جنگ چند بیگھے زمین یا مختصر سا گھر لے کر ہے۔ دنیا میں بھائیوں سے محبت یا گھر سے تعلقات کی بنیاد کا راز یہ ہے کہ دو محبتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ بھائی سے بھی محبت ہو۔ پیسوں سے بھی محبت ہو۔ یہ متضاد چیزیں ہیں

ایک محبت کی قربانی دینی ہو گی یا تو بھائی سے محبت کرو یا چیزوں سے محبت کرو۔ جس طرح خدا کی بندگی میں شریک پسند نہیں۔ ماں کی محبت بھی شرکت غیرے کی روادار نہیں اسی طرح اخوت کے رشتہ میں بھی کسی طرح کی ثنویت نہیں ہو سکتی۔ تم اس کا فیصلہ کرو۔ اور ایک کو قربان کر دو۔

دنیا میں جتنے محبت کے تعلقات ہیں۔ خریدے ہی تو جاتے ہیں۔ والدین کی محبت ان کی خدمت اطاعت سے خریدی جاتی ہے۔ دوستوں سے محبت رواداری کے اصول پر چلتی ہے۔ بھائیوں سے محبت بھی گو والہانہ ہوتی ہے مگر اس کو بھی خریدا ہی جاتا ہے البتہ یہ متاعِ گراں کسی دوکان سے نہیں حاصل کی جاتی۔ بلکہ اس کی خرید و فروخت دل کی دنیا میں پیار و محبت کی خاموش زبانوں سے۔ تغافل سے۔ عظیم قربانیوں سے۔ جذبات کی پامالیوں سے دوسروں کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دینے سے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے

میں ہمیشہ آنے کو تیار ہوں۔ مگر ہندوستان پاکستان نے جہاں بہت سے اقدار فنا کر دیئے۔ وہاں یہ بھی کوئی آسان کام نہیں رہا کہ سفر کے لئے کاغذاتِ راہ داری آسانی سے حاصل بھی کر سکوں۔ میں تمہارے خط کا منتظر رہوں گا۔ جواب دو۔

ایک بات اور سن لو۔ انسان غیروں سے لڑ کر مل بھی جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو

معاف بھی کر دیتے ہیں۔

کچھ دنوں بعد تلخیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ سمجھوتہ کا عنوان اس طرح آسانی سے بن جاتا ہے کہ بھئی غلط فہمی ہو گئی۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا یہ تھا۔ معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔

مگر اپنے عزیزوں سے اپنے پیاروں سے جب تلخی پیدا ہو جائے تو پھر اس کا علاج نہیں۔ معافی نامہ بھی ہو جائے۔ ظاہرہ طور پر تجدید تعلقات بھی پیدا ہو جائیں۔ آمد و رفت کا سلسلہ بھی عود کر آئے پھر بھی وہ تلخی، وہ چبھن خاموش لمحات میں عذابِ جان ہی بنی رہتی ہے۔

اس لئے میرا خیال ہے کہ کامیاب وہی ہے جو ایسی ناخوشگوار ساعت سے نہ گزرا ہو۔ مگر کیا ممکن ہے۔ کون ہے جو دعویٰ کر سکے۔ ایسے سانحہ عظیم کے وقت جو جذبات کے تھپیڑوں کو کچل دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہی مرد ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس آزمائش کے وقت بہ ظاہر کوئی تلاطم نہ دکھائی دے رہا ہو مگر باطنی طور پر جو قیامت گزر گئی اسے کون سمجھے ؎

کیا پوچھتے ہو دیدہ و دل کا مذاقِ غم
طوفاں گزر گئے انہی راہوں سے بارہا

گورنر مشرقی پاکستان

مسٹر ایس ایم. احسن مشرقی پاکستان کے گورنر بن کر براجمان ہیں. آپ ڈھاکہ تشریف لائے. دوسرے مارشل لاء کے یہ پہلے صوبائی گورنر ہیں. لوگوں کی آنکھیں بڑی بیتابی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ آتے ہی انہوں نے شہید مینار پر عقیدت کے پھول چڑھائے. بت پرستی کا آغاز ہوا. غلط طور پر لوگوں کو خوش کرنے کی غلط کوشش کی جانے لگی. لوگوں کے دلوں کو جیتنا یہ اچھا کام ہے. ان کی ہمدردی کرنے کے لئے کوشاں رہنا قابل صد ستائش ہے. مگر کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ضمیر فروشی کرکے غلط جذبات کی تسکین دہی کرا سکتا ہے. جو لوگ زبان کے سلسلے میں اپنی جانیں کھو چکے ہیں. کیا واقعی وہ پاکستان کے لئے کوئی کارنامہ انجام دے کر حیاتِ جاودانی کے مستحق ہیں یا پاکستان کے نظریہ کے خلاف ان کی یہ گھناؤنی خودکشی ہماری مضبوط بنیادوں کو ہلانے میں زہر ہلاہل نہیں ثابت ہو رہی ہے. اگر پاکستان کو کسی چیز نے نقصان پہنچایا ہے تو وہ یہی زبان ہے. یہی وعدہ شکنی ہے. یہی برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ کھلی غداری ہے. اس کی ابتدا آج بھی قیامت خیز ہے اور آئندہ بھی ہلاکت کا طوفان. بربادی کا مواد جتنا یہ مہیا کرتا ہے شاید ہی کوئی دوسرا زہر اس سے زیادہ سم قاتل ثابت ہو.

کیا میں گورنر موصوف سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ جب شہیدوں کی عقیدت میں پھول کے ہار وہ اینٹوں کے ڈھیر پر نچھاور کر رہے تھے تو عبدالمالک شہید کی طرف سے انہوں نے کیوں منہ پھیر لیا.

محمود غزنوی زندہ ہے کیونکہ اس نے پجاریوں کو خوش کرنے کی بجائے خدا کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی لوگوں کی خوشی کا کوئی اعتبار نہیں. اعتبار اس کا ہے جس میں خدا کو خوش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہو.

ایران کا زلزلہ

خراسان میں شدید زلزلہ آیا۔ بہت سے گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ تقریباً بیس ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ پچاس ہزار زخمی۔ لاکھوں بے گھر ہو گئے۔ یہ سب تین منٹ کا کھیل تھا۔ جو سوائے قدرتی ہاتھوں کے اور کون کھیل سکتا ہے۔

اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہیبت ناک عذاب اتنی سرعت اور شدت سے آیا کہ کوئی نکل نہیں سکا۔ ملک میں ماتم ہے۔ کل ساری ایرانی قوم نے سوگ منایا شہنشاہ ایران بذاتِ خود امدادی کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ہنگامی طور پر اس علاقہ میں ہوائی جہازوں کے اُترنے کا بندوبست کیا گیا ہے تاکہ امدادی سامان تیزی کے ساتھ وہاں تک پہنچایا جا سکے۔

ساری دنیا سے ہمدردی کے پیغامات آ رہے ہیں۔ پاکستان نے طبّی امداد بھیج دی ہے مزید کمبل۔ کپڑے۔ دوائیں خیمے بھیجے جا رہے ہیں۔ اعلان کے مطابق پاکستان حتی المقدور ہر ممکن مدد دے گا۔ اور اس مصیبت میں پاکستان کے عوام اور حکومت دامے درمے مدد میں پیش پیش ہیں۔

یہ بھی خدا کا عذاب ہے جو لوگوں پر اس وقت نازل ہوتا ہے جب اس کے احکام کی کھلّم کھلّا خلاف ورزی ہونے لگتی ہے۔ اس کے قانون سے بغاوت اس کے حکم کی عدولی۔ اس کے دکھائے ہوئے راستوں سے گریز۔ اس کے نیک بندوں کے ساتھ تمسخر عام ہو جائے تو یہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ نیک بندے بھی پس جاتے ہیں۔ معصوم بچّے۔ بے گناہ انسان بھی اس کی زد میں آ کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں پر رحم کرے۔

اور ہم لوگوں کو اس عذاب سے بچائے۔ آمین

قائداعظم کی برسی

کل ۱۱ستمبر ۱۹۶۸ء کو قائداعظم کی بیسویں برسی منائی گئی۔ قرآن خوانی ہوئی۔ پرچم سرنگوں رہے۔ عام تعطیل رہی۔ ان کی تقریروں کو سنا گیا۔ ریڈیو پروگرام نشر کئے گئے۔ اتحاد و ملت کی وحدت کا راگ الاپا گیا۔ اور پھر سکوت میں ساری قوم سو گئی۔

ہر سال ہم قائدِ اعظم کی برسی مناتے ہیں۔ خدا کرے مملکت پاکستان اس کو صحیح معنوں میں تاقیامت منائے۔ ورنہ یہ سارے پروگرام مذاق کی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

قائد نے پاکستان کو ایک نظریئے کے طور پر حاصل کیا تھا۔ مسلمان الگ قوم ہے اس کی ثقافت الگ، اس کا مذہب الگ۔ زبان الگ۔ نظریۂ حیات الگ۔ مگر افسوس کہ قائد کی وفات کے بعد سے جو افراتفری اس قوم میں پھیلی ہے وہ ہرگز اس بات کی غمازی نہیں کرتی کہ اس قوم کے اعضا توانا ہیں یا یہ قوم واقعی ایک نظریہ کے تحت وجود میں آئی ہے اور اسی بنیاد پر زندہ رہنے کا حق بھی رکھتی ہے۔

آج اکیسواں سال اس کی جنم کا ہو چکا ہے۔ سنِ بلوغ کی سرحد عبور کر کے اس کو نہایت ہی قدآور۔ جاندار اور حوصلوں سے بھرپور ہونا تھا مگر ہر جگہ انتشار ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ جن بنیادوں پر یہ معرضِ وجود میں آیا آج وہ بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اب اس قوم کا نظریہ اسلام نہیں رہا۔ حلب منفعت کے لئے اس نے علاقائی راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔

کہیں Parity کا ہنگامہ، کہیں کوٹا سسٹم پر اصرار ہے۔ کہیں دھمکیاں ہیں

کہیں غلط نعرے ہیں۔ غرض ہر وہ ہتھیار جو مطلب براری کے لئے وقتی طور پر استعمال ہو سکے۔ کیا جا رہا ہے۔ نفرت۔ مسلمانوں سے بیزاری۔ علاقائیت کا بودا ڈھونگ۔ ایک حصہ کا دوسرے حصہ پر لوٹ کا الزام۔ ملازمتوں میں نالائقیت کے باوجود بھی ترجیحی سلوک کم از کم اس قوم کو زیب نہیں دیتا۔ جس کی بنیادیں مسلمانوں کے ایسے خون کے گاروں پر رکھی گئی ہیں جنہوں نے صرف اسلام اور صرف اسلام کے نام پر اپنا سب کچھ لٹا دیا آج وہی لٹانے والے اس ملک میں اجنبی ہیں۔ بھگوڑے ہیں۔ بے یار و مددگار ہیں۔

ایسی قوم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ محمد علی جناح کی موت پر سوگوار ہونے کا ڈھونگ رچائیں۔ قومیں ابھرتی ہیں۔ اچھے مقصد کے ساتھ اور ڈوب گئیں جب انہوں نے اس مقصد کو پیچھے دھکیل دیا۔

پاکستان کے حصول کا ایک مقصد تھا۔ جب وہ مقصد ہی نہ رہا تو پاکستان رہے رہے نہ رہے۔ ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشہ مے کو ضرورت نہیں پیمانے کی

روسی وفد ہندوستان میں

چند روز ہوئے روسی وفد نائب وزیر خارجہ کی سربراہی میں ہندوستان کے دورہ پر دہلی آیا تھا. تاکہ روس اور ہندوستان کے تعلقات پر وضاحت کرے. اور دوستی کو استوار تر کرنے کی طرف مزید اقدامات ہوں.

دوران گفتگو پاک روس تعلقات. پاکستان کو روس کی فراہمی اسلحہ. زکیوسلوکیا کا بحران. مشرق وسطیٰ کی جنگ معرض بحث میں آئیں. بی. بی. سی نے اپنے ۱۷ ستمبر کی نشریہ میں بیان کیا کہ روس نے زور دیا کہ ہندوستان و پاکستان اپنے تنازعات باہمی گفت وشنید سے طے کریں. روس اس کا خواہش مند ہے. نشریہ میں مزید کہا گیا ہے کہ روس کی خواہش ہے کہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ لوہے کے کارخانے کے قیام میں تعاون کرے اور اس اقدام کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلقات میں تناؤ کم ہوگا. ہم آہنگی کے راستے کھلیں گے. جس سے مسائل کے حق میں بڑی آسانی پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے.

اگر یہ رپورٹ صحیح ہے تو ہمیں اس کو خوش آئند کہنا چاہیئے.

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اس درجہ افسوسناک ہیں جو بیان سے باہر ہیں. کروڑوں انسان اس کی زد میں پس رہے ہیں. آمد و رفت کے سارے دروازے بند ہیں. کتنی ہی سنگین خبریں رشتہ داروں کی طرف سے موصول ہوں. وقت پر پہنچنا ناممکن ہے. خدا کے یہاں جانا آسان ہے. مگر ہندوستان سے پاکستان اور بالعکس آنا جانا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا.

اگر اس کو انسانی پہلو سے بھی دیکھا جائے تو یہ صرف ہٹ دھرمی کے سوا اور

کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کشمیر کا مسئلہ اپنی جگہ پر ہے۔ اس کا حل حکومتوں کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا راستوں کے بند کر دینے سے۔ یا رشتہ داروں۔ عزیز و اقارب کے ساتھ آمد و رفت کے دروازوں کو مسدود کر دینے سے تو یہ کبھی بھی حل نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ برسر اقتدار ہیں ان کا یہ فرض ہے کہ اس انسانی پہلو پر ٹھنڈے دل سے سوچیں اور جلد سے جلد ساری عارضی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اسی میں بھلائی ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس سے تعلقات میں لچک پیدا ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے قریب تر ہوں۔ اپنے مسائل کے حل کے لئے حکومت پر زور دیں۔ اور برسوں کی یہ غلط فہمیاں دور ہوں۔

اگر ایسا نہ ہوا یا اس طرف سے بے اعتنائی برتی گئی تو ہمیں ڈر ہے اس کا حل عوام مجبور ہو کر خود تلاش کرنے کی طرف کہیں کمر بستہ نہ ہو جائیں۔

۸ر جنوری ۱۹۶۷ء

ایبڈو زدہ سیاست دان

سیاست بھی شطرنج کی طرح ایک کھیل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شطرنج کے کھیل میں بے جان مہرے پیٹتے ہیں۔ مگر سیاست میں جاندار مہرے مارے جاتے ہیں کبھی کبھی کھلاڑی بھی جان کی بازی دیدیتا ہے۔ مگر اس کھیل میں کھلاڑی اپنی جیب سے کم دیتا ہے بلکہ دوسروں کی جیب کو زیادہ لوٹتا ہے۔ لٹنے والے عوام ہوتے ہیں۔ یہ ایک سلسلہ ہے لامتناہی جس نے پیشہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ جب طوفان آیا۔ کونا پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اور جب مطلع صاف ہوا۔ عوام کی بھلائی کا راگ۔ حاکمانِ وقت کی قطار میں صف بندی یا مخالف جماعتوں کے ساتھ حکومت کے خلاف جمہوریت کے نام پر نعرے۔ عوام زندہ باد وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر سیاست دان انسانی ہمدردی کے جذبہ سے خالی صرف شخصی مفاد کی خاطر ہنگامہ پر کمربستہ ہیں۔

ایبڈو زدہ سیاست دان جن کو بادِ مخالف کے جھونکوں نے ۱۹۵۰ء کے موسمِ بہار میں آگھیرا تھا۔ ان کو ہنگامی قانون نے سیاست بازی سے کنارہ کشی کے لئے مجبور کردیا تھا ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک ان کی زبانوں پر تالے ڈال دیئے گئے تھے۔ اور ساری سیاست گردی کرنے والوں کی جماعت بے آہ وفغاں یکم جنوری ۱۹۶۷ء کی منتظر تھی۔ چنانچہ وہ دن بھی آیا اور اب پھر بال و پر تولے جارہے ہیں اور قوتِ پرواز کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ کچھ بیانات ہیں۔ ماضی سے انحراف ہے مستقبل کے منصوبے ہیں۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر پٹے ہوئے مہرے ہیں۔ یا ایسی پست ذہنیتوں کے کردار ہیں۔ جو عوام کی

ہمدردیاں پھر کبھی حاصل کر سکتے۔ یہ گزشتہ آٹھ سال کے مردے ہیں۔ جو دوسروں کو چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

ان کا کھوکھلا نعرہ جمہوریت کا ہے۔ جو حلِ مشکلات کا شاید ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ ان میں اکثر وہ چراغِ راہ تھے جن کو قائدِ اعظم کی شخصیت نے ابھرنے کا موقع دیا تھا اور قوم نے ازراہِ عقیدت یا خدمت ان کو ہرگز نہیں چنا تھا۔ بلکہ وہ جذبات کی پیداوار تھے۔ اور اپنی اس پیدائش کے جواز کو وہ قوم سے منوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

ان کی کمزوری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ گناہوں کا محاسبہ دو یا خاموش رہو۔ وہ محاسبہ تو دینے سے رہے۔ ہاں خاموشی میں نجات ملی۔ زباں پر پابندی اور مہرِ سکوت پر رضا۔ لیڈروں کی شان کی رسوائی ہے۔ رسوائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ سارے حضرات بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔

استفسار پر یہ جواب فرماتے ہیں کہ جس گوشۂ گمنامی سے وہ نکلے ہیں۔ اس میں ان کو سیاسی سوچ بچار کا موقعہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب وہ مشورے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ کسی فیصلے پر آئیں گے۔ آخر وہ کون سی قعرِ مذلت میں پھینک دیئے گئے تھے۔ جہاں ملک کی گرم و سرد ہوائیں بھی اُن سے گریز کر رہی تھیں۔

لیڈر پودوں کی طرح مٹی میں پرورش پاتا ہے۔ اور وہیں سے وہ پروان چڑھ کر پھول کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ عوام لیڈری کے لئے مٹی ہیں۔ ان میں رہنا ان کے مصائب سے واقفیت پیدا کرنا۔ ان کے مزاج کو پہچاننا۔ یہی ہے خدمتِ خلق اور مقبولیت کا واحد ذریعہ۔ بدقسمتی سے چند کے سوا ہمارے لیڈر ہمالہ کی چوٹیوں پر یک بیک ٹپک جاتے ہیں۔ کوئی دفعہ ۹۳ لاگو کر کے تمام قانون اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے کوئی اور صورت اختیار کرتا ہے۔ کوئی دوسری مہم چلاتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ عوام کیوں ساتھ

دیتے ہیں۔ وجہ صاف ہے جو آیا گناہوں میں ڈوبا۔ پھینک دیا گیا۔ عوام نے سمجھا شاید تبدیلی بہتر ہو۔ مگر سارے خواب عدم تعبیر کی وجہ دیوانے کے خواب ہی جیسے رہے۔

جب برطانیہ کی حکومت تھی۔ اگست ۱۹۴۲ء میں انگریزوں نے گاندھی جی کے (Quit India) "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے پر لیڈروں کو قید کر لیا تو مہینوں ہندوستان کا نظم و نسق درہم برہم رہا۔ انگریزوں نے سمجھ لیا کہ اب اس قوم کو دبا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ جیسے ہی لڑائی ختم ہوئی۔ مذاکرات ہوئے۔ وفود آتے اور ان کو اپنا بستر گول کرنا پڑا۔ ہندوستان میں آج بھی ایسے لیڈر رہیں جو قابلِ صد احترام ہیں۔ جن کی آوازیں سنی جاتی ہیں۔ جو زندہ ہیں۔ کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں۔

ہمارے ہاں اکثر لیڈر کرسی چھن جانے کے بعد ہی مر جاتے ہیں۔ پھر ان کا نہ کوئی اخباروں میں بیان آتا ہے اور نہ عوام سے ہی ان کو دلچسپی۔ نہ وہ دعوتوں میں مدعو ہوتے ہیں۔ نہ کسی بزم کی رونق ان سے دوبالا ہوتی ہے۔ ہاں ایک کام وہ ضرور کرتے رہتے ہیں: "جوڑ توڑ" جس سے ملک کا وقار گرتا ہی رہتا ہے۔ پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ان کو نہ ملک کے استحکام کی پرواہ ہوتی ہے نہ قوم کی خوش حالی کا جذبہ۔ ان کے منہ کو خون لگ جاتا ہے اقتدار کا۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ ولایت کے بہت سے مدارج ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ "مدح مادح" یا "لومتہ لائم" کی پرواہ نہ ہو۔ یعنی کسی تعریف سے کوئی خوشی نہ ہو۔ یا کسی کی ملامت سے کوئی کبیدہ خاطر نہ ہو۔ کیونکہ ولایت کے لئے خدا کی خوشنودی میں خود کو مٹا دینا ضروری ہے۔ ہر کام خدا کو راضی کرنے کے لئے ہو۔ تو پھر ظاہر ہے اگر کسی نے تعریف کر دی یا ملامت کر دی تو اس کا اثر ایسے شخص پر کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی ولایت کے درجہ کی دوسری شق "لومتہ لائم" کی پرواہ نہ ہوتا ہے۔ یہ صفت بدرجہ اتم لیڈروں میں موجود ہے۔ یعنی ولایت کے اس درجہ پر البتہ وہ ضرور متمکن نظر آتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ "مدح مادح" والی شق کے بھی یہ اہل ہو جائیں۔ آمین

ایبڈو زدہ سیاست داں اب جو بیانات دے رہے ہیں یاد دینے والے ہیں اس سے کیا حاصل۔ ان کو جب قدرت کی طرف سے مواقع نصیب ہوئے تھے تو وہ نہ خدا کو خوش کر سکے اور نہ عوام ہی ان سے خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں جو کچھ کیا وہ صرف اس لئے کہ ان کی ذاتِ گرامی کو تسکین مل سکے۔ مگر یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ حسن نے خود کو ٹھگ دیا۔ دنیا کی خوشی اس کے اشاروں پر ناچتی نظر آئی۔ کیونکہ دوسروں کو خوش رکھنے والا خدا سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ خدا نے اپنے پیاروں کو کبھی شرمندہ نہیں کیا ہے۔ انہوں نے جو کیا اپنے لئے کیا۔ اس لئے ان سے کوئی خوش نہیں ہے۔

اِن حالات کے پیشِ نظر ایبڈو زدہ سیاست دانوں کے لئے اسی میں نجات کا راز پوشیدہ ہے کہ وہ باقی ایامِ زندگی۔ یادِ خدا میں گزاریں۔

پاکستان کو اس وقت ہنگاموں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو امن چاہیئے۔ استحکام چاہیئے۔ ملک کی ترقی کے لئے اچھی حکومت چاہیئے۔ اور ایسی مخلص جماعت جو حکومت کو صحیح راستے پر رکھنے کے لئے ایمانداری سے نکتہ چینی کرتی رہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ بنیادی طور پر قلم اور زبان آزاد ہوں۔

اِن دنوں کچھ سیاست داں نہایت ہی غلط رویّہ اپنا رہے ہیں۔ جو روحِ اسلام کے خلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام میں مخالف پارٹی کا تصور ہی نہیں ہے حضرت عمرؓ سے بڑھیا کے اعتراض کی تاویل بقول ان کے انفرادی اہمیت کی غمازی کرتا ہے من حیثیت جماعت کہیں مخالف پارٹی کا وجود نظر نہیں آتا۔

افسوس ہے کہ رسول صلعم کی وہ حدیث کہ:۔

الاختلاف رحمۃ فی امتی۔

کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔ جہاں آپ نے فرمایا تھا کہ اختلاف میری اُمت میں

رحمت کا باعث ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہمت افزائی کی جاسکتی ہے۔ یہ تاریخ کا بڑا ہی المناک سانحہ ہے کہ ملک کو جمہوری اقدار سے محروم کرنے کی بڑی گہری سازش کی جارہی ہے۔ اختلاف کا سرے سے نہ ہونا یا اس کو غیر اسلامی کہنا کتنا بڑا ظلم ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ من حیثیت جماعت بھی اختلاف رہا ہے۔ فتح خیبر کے بعد تقسیم مالِ غنیمت میں انصارِ مدینہ کا اعتراض یہ کس بات کی دلالت کرتا ہے جس کا جواب خود ذاتِ اقدس نے دیا۔ اور انصار خوش ہو گئے۔ بلکہ اس واقعہ سے تو یہ بھی پتہ چلا کہ رسول صلعم جو معصوم تھے۔ ساری قوم کے سرتاج تھے وہ بھی اختلاف سے دوچار ہوئے اور اس اختلاف کو مذموم نہیں قرار دیا۔

حضرت علی اور حضرت عائشہ کی جنگ جو جنگِ جُمل کے نام سے مشہور ہے۔ کیا وہ انفرادی لڑائی تھی۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ کی کش مکش کون کہہ سکتا ہے کہ انفرادی نوعیت کی تھی۔

ڈکٹیٹر شپ کے جواب میں ظاہری طور پر جو دلائل پیش کئے جائیں یا جو مصلحتیں بیان کی جائیں اس کو قوم مان لے یا ٹھکرا دے۔ اس سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ مگر غلط نظریہ پیش کرنا اور مذہب کا مقدس نام اس سے وابستہ کرنا یہ افسوسناک حادثہ ہوگا۔ یہ مذہب۔ قوم۔ ملک اور خود اپنی ذات کے ساتھ ظلم کے مترادف سمجھا جائے گا۔

بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے علمائے سو نے حدیثیں تک وضع کر لیں نہ وہ بادشاہ رہے نہ وہ واضعانِ حدیث۔ اسی طرح ایماندار معترضین اور مخالفین پر پابندیاں لگانے والے انہیں بیڑیاں پہنا کر تاریک کوٹھڑیوں میں بند تو کر سکتے ہیں مگر ان کی زبانوں پر تالے کون لگا سکتا ہے۔

وقت کا مورخ عبدالقادر بدایونی کی شکل میں اپنی بیاض کے لئے بیٹھا لکھ

رہا ہے۔ کون ہے جو اس کو روک دے۔ جہانگیر ہو یا کوئی اس جیسا اور شہنشاہ مورخ کی اولاد سے مچلکہ لکھوائے۔ مزید طباعت کی اجازت وہ نہیں دے گا مگر اس دور میں کیا ممکن ہے۔

وقت نے کسی کو معاف نہیں کیا ہے۔

تاریخ نے ہمیشہ غلط اندازِ فکر کو مٹا دیا ہے۔

۱۴ جنوری ۶۷ء

مرن برت

ہندوستان آزاد ہے مگر یہ آزادی کس کے لئے ہے!

وہاں کی ہندو اکثریت جس نے انگریزوں کی غلامی کا طوق ۔ بصد شوق ۔ تبدیلیٔ آقا کے خیال سے پہنا تھا۔ آزادی سے مستفیض ہو رہی ہے۔ وہ مسلمانوں سے پرانا بُغض نکال رہے ہیں۔ مسلمان فاتحین حملہ آوراں شہنشاہان جو بھی آئے چونکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے تھے اور اب جو مسلمان ہیں یہ بھی چونکہ مسلمان ہیں اس لئے اگلوں کے سارے گناہوں کی یادگار ہیں۔ موردِ الزام۔ گردن زدنی اور کیا کچھ نہیں ہیں۔ ہندو کے غیض و غضب کا براہِ راست نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ شاید قدرت کا کوئی الٹ پھیر ہو اور ان کے بھی دن پلٹیں۔

سکھ جو اپنے کو ہندو ہی سمجھتے تھے یا ہندوؤں سے اچھی امیدیں باندھے ہوئے تھے آج لادین بھارت میں مجبور، مطعون۔ سیکنڈ کلاس شہری مشکوک اور مشتبہ نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ آزادی کے وقت انہوں نے جو مسلمانوں پر مظالم توڑے خود وہ اس کے شکار ہیں۔

پہلے تو مرن برت ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ کا۔ جو ناکام ہوا۔ پھر دوسرا مرن برت سردار فتح سنگھ نے ۱۷ دسمبر ۶۶ء سے شروع کیا اور ۲۷ دسمبر کو جل مرنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ وہ بھی ہندو سازش نے ناکام بنا دیا۔ اب سکھ قوم منتشر۔ غیر منتظم۔ مغلوب گماں۔ مرعوب اور شکست خوردہ۔ جب تک یہ من حیثیت قوم نہیں ڈوب جاتی ہندوستان کو چین نصیب نہیں ہوگا ... ان کے گناہوں کی قرار واقعی سزا ہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی موت

اور ہندوستان کی بربادی دونوں کا ٹکراؤ ایک ہی ساتھ ہو۔

تقسیم ہند کے وقت قائد اعظم نے سکھوں سے کہا تھا کہ تم اپنا وطن منتخب کرلو۔ اور مسلمانوں سے مل کر رہو۔ مگر انہوں نے اپنی تلواریں ہوا میں لہرانی شروع کردیں اور سمجھنے لگے ہندوستان کی آزادی ان ہی کے بل بوتے پر ہو رہی ہے۔ تقسیم ہند ان کی دھمکیوں سے رک جائے گا۔ جن فتنوں کو انہوں نے جنم دیا آج وہ خود اسی میں گرفتار ہیں۔ ان سے مفر کی ان کے لئے کوئی صورت نہیں اولاً تو ہندو کبھی اس پر راضی نہیں ہوگا کہ ان کو صحیح و توانا علیحدہ صوبہ دیدے۔ بفرض محال اگر ان کو مل بھی گیا تو یہ ان کی موت کے مترادف ہوگا۔ تمام صوبوں سے وہ نکال دیئے جائیں گے۔

وسیع و عریض ہندوستان ان کے لئے بند ہو جائے گا۔

شاید سکھ یہ بھی سوچ رہے ہوں کہ علیحدہ صوبہ حاصل ہوجانے کے بعد وہ آزادی کی طرف دوسرا قدم اٹھائیں گے۔ اس کے لئے زمین ہموار کریں گے۔ لڑیں گے۔ مگر یہ خواب کہاں تک شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ وقت ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ ایک بات البتہ ضروری ہے کہ آزادی سے لے کر اب تک ہندوؤں نے ان پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ سکھوں سے جو جو وعدے کئے وہ کبھی وفا نہیں ہوئے۔ اب یہ عدم اعتمادی رہی اور جب دو قومیں آپس میں اعتماد کھو بیٹھیں۔ تو اس کا لازمی انجام موت ہی ہے۔ کسی ایک کی موت ہو۔ سوگواری دونوں کی قسمت میں شاید لکھی جاچکی ہے۔ ہندوستان کو اور ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہے۔

من قماش فروش دل صد پارہ خویشم

تقسیم کے وقت سکھوں نے مسلمانوں پر جو جو مظالم ڈھائے۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔ الور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ نابھا کی مسلمان آبادی ان ہی کے وحشیانہ اور غیر انسانی مظالم سے صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی۔ بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی ان کی کرپانوں کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ درندوں کی طرح کمزوروں پر ٹوٹ پڑے

بستیوں کو جلایا بجاگنے والوں پر حملے کئے ۔ پناہ گیروں کی ٹرینوں کو لوٹا۔ خون میں نہائے ان کی "مقدس شکل کا دوسرا نام" "درندہ" رکھا جائے وہ بھی کم ہے۔

آج قدرت نے ان کے اعمال کو ان کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے قلب کو کبھی چین نہیں مل سکتا۔ ان کی آبادی کبھی سُکھ سے نہیں رہ سکتی۔ مَرن بَرت ہو یا اس کا دوسرا مقدس نام رکھا جائے۔ خدا کے انتقام سے یہ کہیں جائیں بچ نہیں سکتے۔ ہندوستان کی تاریخ ۱۹۴۷ء میں لکھی جا چکی ہے۔

وہاں سکھوں کا کوئی نام و نشان من حیثیت قوم نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی اپنی خلل دماغی "غرور" اور "رام راج" کا مزہ چکھنا باقی ہے۔

اس وقت پورا ہندوستان قحط۔ خشک سالی۔ انتشار کے دروازوں پر کھڑا ہے۔

تلاشِ سکون

ایک ہفتہ سے طبیعت اداس ہے۔ مرض غالباً کچھ نہیں۔ زکامی کیفیت دو تین روز رہی۔ طبیت کو چنگا ہونا چاہیئے تھا۔ اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ کمزوری کا غلبہ ہے۔ پتہ نہیں یہ کمزوری کہاں سے آگئی۔ اور اب جانا ہی نہیں چاہتی۔ مرض کی تو اتنی فکر نہیں۔ کیونکہ ہر مرض کا علاج خدا نے پیدا کیا۔ مگر دل کا علاج اور سکونِ قلب کا مداوا ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ کاش یہ متاعِ عزیز بھی بازار میں بکتی اور تشنگانِ سکون اسے خرید سکتے۔ اس کی خرید و فروخت اگر عام ہوتی تو اس کی چاہ بھی نہیں رہتی۔ دنیا سرگرداں ہے کہ سکون میسر ہو۔ اس کے حصول کے لئے ماحول بدل لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غیر ممالک میں تفریح کے لئے لمبے لمبے سفر اختیار کئے جاتے ہیں۔ تاکہ تمام زنجیروں کو وقتی طور پر کاٹ کر اس کی جھنکار کی آواز سے پرے ایک خیالی دنیا بسائی جاسکے جو بالکل روزانہ کی ہماہمی اور جکڑبندیوں سے پاک ہو۔ جہاں وہ کمہلائی ہوئی صورتیں جن کو دیکھ دیکھ کر سوہانِ روح ہوتی ہو۔ آنکھوں سے چھپی رہیں۔ جہاں روزانہ کی ضرورتیں اور ان کو پورا کرنے کی جدوجہد سے بے نیازی ہوسکے۔

جہاں قلب کی حرکت سننے والا سوائے اپنے کوئی دوسرا نہ ہو۔ جہاں دماغ کو کسی پیچیدگی سے سابقہ نہ ہو۔ مگر یہ بھی ناممکن ہے۔ انسان کی زندگی کسی ایک گتھی کا نام نہیں۔ بلکہ ہزاروں گتھیاں ہیں۔ جن کو سلجھاتے سلجھاتے شخصِ واحد ایک مجموعۂ اضداد بن جاتا ہے اور اس کی شخصیت اسی سے ہویدا ہوتی ہے۔ شخصیت کیا ہے انسانی کشمکش اور اس کو اپنے طور پر درست

کرنے کا نام ہی تو شخصیت ہے۔ جب کسی ذاتِ واحد کا نام آیا گتھیاں سامنے آئیں اور اس کو سلجھانے کی صلاحیت کا عنوان بھی اس طرح آیا کہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔

مثال کے طور پر دنیا کے بڑے لوگوں یا بڑی شخصیتوں کا جائزہ لیجئے۔ گاندھی کا نام۔ جناح کا نام۔ چرچل کا نام۔ نہرو کا نام۔ بغیر اِن گتھیوں کے آہی نہیں سکتا جن سے یہ شخصیتیں دوچار ہوئی ہیں۔ کس طرح ان کے عزائم نے، ان کی وجدانی صلاحیتوں نے اِن مصیبتوں سے نبرد آزمائی کی ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی بیہم تسلسل کے ساتھ ایک غیر فانی کردار کی تکمیل میں مشغول تھی۔ جس نے انھیں شخصیت بخشی اور ان کی عظمت کو چار چاند لگاتے۔ اگر یہ ہستیاں زندگی کی گتھیوں سے الگ رہتیں تو شخصیت کا جائزہ لینا بڑا مشکل ہوتا۔ اور حیاتِ جاودانی کبھی ان کے حصّہ میں نہیں آتی۔

شعبدہ بازی

بیسویں صدی انسانی ترقی کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آئے دن محیرالعقول کارنامے وجود میں آرہے ہیں۔ انسانی خواہش بھی عجیب ہے۔ پہلے پرندوں کی طرح اڑنا ہی انتہائی عروج تصور کیا جاتا تھا۔ آج پرندوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ پرواز ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کی جاچکی ہیں۔ برفانی چوٹیاں اوران کے منجمد سینے انسانی گرمیوں سے بے آب ہیں۔ جب یہ مدارج طے ہوچکے توچاند کو نشانہ بنانا سوجھا۔ اب وہاں کمند پھینکنے جارہے ہیں۔ اقبال نے شاید یہ شاعری نہیں کی تھی ؎

محبت ہمیں اُن جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

یہاں توچاند پر بسیرا بنایا جارہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب انسان مع اس مادی جسم کے وہاں پہنچ کر اس کرۂ تاباں کو بھی اپنی آلائشوں کی آماجگاہ بنادے۔ تب کیا ہوگا۔ اس کا جواب مشکل ہے۔ فرض کرلیا جائے وہاں تک پہنچنے میں شعبدہ باز کامیاب ہوگئے تو وہ عدم کو جانا ہوگا۔ اور جس کو اسرارِ قدرت کا سراغ مل گیا اس کا پتہ دنیا والوں کو نہیں ہوگا۔ ع

آنہا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

موجودہ دور اور سائنسی ایجادوں کا رجحان بربادی کی طرف ہے۔ بربادی کے نامعلوم ہتھیار اور انسانیت کو فنا کرنے کے غیر محدود سامان خود آدم کی اولاد نے نکالے پہاڑوں کو سر کیا جارہا ہے۔ سمندر کی تاریک گہرائیوں میں وہ گھات لگاتے بیٹھا ہے

اُیٹم اور ہائیڈروجن سے مسلح کائنات کی طرف وہ دیکھ رہا ہے۔ اشارہ کا منتظر خود اپنی ہلاکت کا باعث۔ مغرور انسان خوش ہے۔

لوگ کہتے ہیں دنیا کی ترقی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج سے بہت پہلے جس کو ہم تاریک یا ایام جہالت کے دور سے پکارتے ہیں وہی دور اچھا تھا۔ کیونکہ اس میں چاند اور سورج کی طرف بھاگنے کی گرچہ آرزو نہ تھی۔ اور نہ یہ ہتھیار تھے جس سے چشم زدن میں بڑے بڑے شہر روئی کے گالوں کی طرح اُڑائے جا سکیں۔ بلکہ وہ جذبہ تھا جس کی تلاش میں روئے زمین کے چپہ چپہ کی پیمائش کی جا رہی تھی تاکہ انسانیت اور انسان ہلاکت سے بچ سکے۔

آب حیات کی تلاش کا دور اس مردم کش ترقی سے ہزار گنا بہتر تھا۔

محبت ہمیں اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

کل تک یہ بات ناقابلِ تصور و غیر یقینی سمجھی جاتی تھی کہ چاند پر کوئی انسان پہنچ بھی سکتا ہے۔ آج ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء کا وہ حیرت انگیز و مبارک دن ہے جس نے صبح ہوتے ہی یہ پیغام ساری دنیا کو سنایا کہ خلانوردوں کا جہاز اپالو گیارہ ۱۱ (APOLLO 11) تین خلابازوں کے ساتھ

آرم اسٹرونگ Neil Arm strong

ایڈون الڈرن Edwin Aldrin

مائیکل کولنس Michael collins

اب اترنے والا ہی ہے۔ دو خلانورد آدم اسٹرونگ۔ ایڈورڈ الڈرن۔ مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق ۲ بجکر ۱۷ منٹ پر آدھی رات بعد اصل جہاز سے علیحدہ ہو کر اس کاڑی پر جو خاص اسی مقصد سے بنائی گئی تھی چاند پر اترے۔ یہ انسان کا سب سے بڑا متحیر کن۔ تعجب خیز ناقابلِ یقین۔ بے پناہ انکشافات سے لبریز کارنامہ ہے۔

اب ہمیں بہت ہی آگے کی طرف دیکھنے کا بڑا شاندار موقع ملا ہے۔ زمین۔ زمین پر بسنے والے جتنی خوشیاں منائیں کم ہے۔ مگر وہ سیارے جو آج تک اپنے کو مامون و محفوظ سمجھ رہے تھے یقیناً حیران و پریشان ہوں گے۔

خالقِ عقلِ انسانی زندہ باد

اقبال

(طلبا کی فرمائش پر)

جنرل مونٹگومری نے اپنی مشہور کتاب *Path to Leadership* میں کہا ہے کہ اگر کسی قوم کے پاس ایٹم بم نہ ہو تو کوئی افسوس کی بات نہیں ہے لیکن اگر اس کے پاس کوئی نظریہ حیات نہ ہو تو یہ انتہائی خطرناک ہے۔ ایسی قوم کا زوال لازمی ہے۔

اقبال کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں نظریہ پاکستان دیا۔ اس کے حصول کے لئے قائد اعظم کی سرکردگی میں برصغیر کی ساری مسلم آبادی متحد و منظم ہو کر ایک چٹان بن گئی۔ اور اپنی تہذیب۔ ثقافت۔ زبان کی حفاظت کے لئے جو قربانیاں دیں اس کی مثال شاید دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی بھی شاید ہی کوئی مثال ملے کہ اتنی جلد کسی قوم نے کسی نظریہ کو اس آسانی سے پس پشت ڈال کر اس بے پرواہی سے محوِ آرام ہو جیسی کہ پاکستانی قوم۔

چھ کروڑ کی مسلم آبادی اسی نظریہ پاکستان کے لئے معتوب و مقہور اور دس کروڑ کی پاکستانی آبادی نظریہ حصولِ زر کے لئے سرگرداں و بے چین۔ یہاں مسلم تہذیب ایک مذاق ہے۔ یہاں ثقافت و زبان کی نشان دہی فتنے سے کم نہیں۔ نظریہ پاکستان نے سارے تعلقات منقطع کر دیئے تھے۔ اور ایک ہی رشتہ "رشتۂ اسلام" باقی رکھا تھا۔ حصول پاکستان کے بعد سارے دنیاوی رشتے زندہ ہو گئے اور اسلام کا رشتہ کٹ گیا۔ ۔۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاکِ کاشغر

اب بتایئے اقبال کی کوئی جگہ ہے یا یومِ اقبال کا کوئی حاصل ہے۔

تاریخ کا یہ نہایت ہی دردناک باب ہے کہ جب جب مسلمانوں کو خدا نے حکومت سلطنت اور دولت سے نوازا ہے اکثر و بیشتر وہ جماعتیں جو اِن ذرائع پر قابض رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے کردار سے حکومت، سلطنت، دولت کے تحفظ کے لئے اپنی من مانی کی ہے۔ اور مذہب کو بالائے طاق رکھا ہے۔ نہ صرف بالائے طاق بلکہ وہ بندگانِ خدا جن کی زبانوں پر وہ مہرِ سکوت نہ ڈال سکے معتوب رہے ایسے ہی فرزندانِ توحید کے دربار میں پہنچ کر اقبال نے کہا تھا۔ ع

گردن نہ جھکی جس کی شہنشاہ کے آگے

جن لوگوں نے فانی چیزوں کو بچانے کی کوششیں کیں خود فنا ہو گئے۔ کاش اگر یہ لوگ اسلام کو سہارا دیتے تو ہندوستان اور پاکستان کا قصہ ہی نہیں رہتا۔

آج پاکستان کو جتنی ضرورت اقبال کی ہے کسی دوسری قوم کو نہیں ہے کیونکہ یہ ملک نظریات کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اگر اس کی بنیاد ہی ہل گئی تو لازمی طور پر اس کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔

اقبال نے اپنی شاعری کو ذریعہ پیغام رسانی بنایا۔ شکوہ بھی کیا تو ایسا کہ ملائک تک چونک گئے۔ جوابِ شکوہ دیا تو مردے قبر میں کروٹیں بدلنے لگے۔

اقبال کی آمد وقت کی پکار تھی۔ مسلمانانِ عالم پر جمود طاری تھا۔ غلامی کی زنجیریں سمنت سے سخت تر تھیں۔ دنیائے اسلام کراہ رہی تھی۔ ایسے وقت میں علامہ مشرق نے جو سُر الاپا اُس نے نہ صرف مردوں کو زندہ کر دیا بلکہ اُن کے رگِ حمیت پر بھی ایسی ضربیں لگائیں جس سے ان میں عظیم الشان ماضی کے کھو جانے کا صدمہ

اور روشن مستقبل کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ اقبال نے ہر ہر موڑ پر مسلمانوں کو احساس دلایا کہ تم کیا تھے اور اب کیا ہو۔

کہیں اس نے کہا۔ ع

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

کہیں اس نے اس سجدہ کو نمایاں کیا جو "صنم آشنا ہے۔" کہیں اس نے جوانوں کو خبردار کیا کہ ؎

تیرے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو کے خون رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

معاشرہ کی ہر کمزوری پر اس نے اس خوبی سے ٹھوکر ماری جیسے بات سب کہدی مگر مردم آزاری کا شائبہ تک نہ ہوا۔ جیسے۔ ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرہ

کبھی وہ کہتا ہے۔ ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

کبھی وہ کہتا ہے کہ مدرسہ اور خانقاہ سے میں نا امید واپس آیا۔ کہیں کہتا ہے

زمیں پر صُوفی و ملّا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند مارا

شعر و شاعری سے بدظن ہوا تو اس نے لندن سے لکھ بھیجا ؎

مدیرِ مخزن سے جا کے اقبال کا یہ کوئی پیام کہدے
کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اقبال نے شاعری بامقصد کی۔ نوجوان طبقہ ملک کی سب سے بڑی دولت ہے
چنانچہ وہ ان کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

—٭—

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

بدقسمتی سے آج ہمارا یہی طبقہ مستقبل کے لئے امید افزا محسوس نہیں کیا جارہا ہے
جب اس نے اپنے لڑکے کو بغرضِ حصولِ علم لندن بھیجا تو ہر باپ کی طرح اس نے بھی یہ
محسوس کیا کہ تعلیم اگر الٹی ہوگئی تو کیا ہوگا۔ چنانچہ جاوید کے نام اس نے نظم بھیجدی ؎

دربارِ شہنشاہی سے خوشتر۔ مردانِ خدا کا آستانہ
جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف۔ تعلیم ہو گو فرنگیانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا طریق عارفانہ

اقبال کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ تعلیم جو لادینیت کی طرف لے جائے وہ تعلیم نہیں ہے
اس کی وسیع نگاہوں نے اس تعلیم کو قریب سے دیکھا تھا جو اکثر ہندوستانی مسلمان نوجوان
انگلستان جا کر حاصل کرتے تھے اور حقیقت میں سب کھو کر واپس آتے تھے۔ کوئی برگسان
کا مرید بن جاتا تھا۔ کوئی نطشے کا ثناخوان۔ فرماتے ہیں ؎

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہیں طلسمات اس کے سب خیالی

سید زادے سے مخاطب ہوئے تو فرمانے لگے ؎

میں اصل کا سومناتی ⁂ آبا مرے لاتی ومناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد ⁂ مری کفِ خاک برہمن زاد

نطشے جس کے دام تزویر میں اکثر نوجوان آجاتے اس کو اقبال نے باوازِ بلند کہا

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ غیر متوازن تقسیم زر، شہنشاہیت۔ بغاوت لادینیت پھر کمیونزم کی طرف جھکاؤ۔ اقبال نے کیا خوب کمیونزم کا نقشہ پیش کیا ہے

آنکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

آگے جاکر اقبال نے پیش گوئی کی ہے کہ اسلام کے دو جزو ہیں۔

لا الہ پھر الا اللہ

ابھی پہلی شق پر کمیونزم نے ایمان لایا ہے اور یہیں سے دوسری شق کی صدا اٹھنی بھی ضروری ہے۔ خدا کرے یہ صحیح ثابت ہو۔ آمین

اقبال عظیم انسان ہے۔ اسی لئے اقبال کی شاعری۔ سادہ۔ عام فہم اور جگر سوز ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے قلب سلیم کی ضرورت ہے۔ جس طرح مشہور ہے کہ "بڑے لوگ سادہ ہوتے ہیں" اسی طرح بڑے لوگوں کے کلام بھی آسان ہوتے ہیں۔ اس کا سمجھنا بھی آسان تر ہے۔ اس لئے کہ ایسے لوگ فضول گو نہیں ہوتے۔ بات سیدھی اور دو ٹوک کرتے ہیں۔ خیالات پر ایسا عبور ہوتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے ایسی بے چین جیسے کوئی فطری امر ہو۔ جس طرح شہد کی مکھیاں مجبور ہیں کہ شہد پھینک دیں۔ اسی طرح بڑے مفکر بھی مجبور ہیں کہ وہ اپنے جذبات کو انڈیل کر رکھ

دیں اور کہتے سنائی دیں۔ ع

من قماش فروشِ دلِ صد پارہ خویشم

کوئی قدرداں آگے بڑھے اور اس سے فائدہ اُٹھائے۔

ایک قدم میں اور آگے بڑھتا ہوں۔ تمام بڑوں میں بڑا خالقِ مطلق ہے اس کا کلام قرآنِ پاک کا بھی یہی حال ہے۔ سادہ۔ دوٹوک اور آسان۔

اقبال سے ذوق رکھنے کے بعد قرآنِ پاک کا مطالعہ بھی ضروری ہے اور ہم جتنا اقبال سے قریب ہوں گے قرآن کے متبع ہوں گے اور اسی میں ہماری نجات کا راز مضمر ہے۔

پاکستان کی بقا کے لئے اقبال کی شاعری اور اس کے نظریے کی پرچار بہت ضروری ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کے دو حصے ایک دوسرے سے الگ ہیں اس کے نقصانات بھی ہیں۔ مگر فائدے نقصانات سے زیادہ ہیں۔ دنیا کا واحد ملک پاکستان ہی ہے جو مغرب کی طرف سے مشرقِ وسطیٰ اور یورپ سے جاکر ملتا ہے۔ اور مشرق کی جانب جنوب مشرق کی دنیا سے منسلک ہے۔

اگر یہ دونوں حصے اسلام کے رشتے کو توڑ دیں۔ تو پھر ان کی آواز کمزور غیر مؤثر ہو کر رہ جائے گی۔ نظریاتی طور پر تخلیق پاکستان بیسویں صدی کا معجزہ ہے۔ سیاسی طور پر اگر یہ آپس میں Parity کے چکر میں مبتلا رہے اور علیحدہ ہو گئے تو یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا فراڈ ہوگا اور اس کے نتائج ایسے تباہ کن ہوں گے جس کا تصوّر بھی حیران کن ہے۔ اس لئے بھی ہمیں اقبال کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ اس نے ہندوستان سے لے کر تاشقند تک اتحاد کا علم بلند کرنے کی دعوت دی ہے۔

اعلانِ تاشقند

ہندوستان و پاکستان کی سترہ روزہ جنگ کے دوران وزیر اعظم روس مسٹر کوسیجن نے دونوں ممالک کے سربراہوں سے یہ کہا تھا کہ لڑائی بند کر دی جائے اور تاشقند میں ملاقات کا انتظام بشرطِ رضامندی جانبین ۔میں کرنے کو تیار ہوں بہ ظاہر یہ اعلان اس وقت اتنی اہمیتوں کا حامل تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی لئے دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے لیت و لعل کے ساتھ قبول کیا۔

دنیا کی تاریخ میں ایسی پیش کش کی مثال شاید ہی مل سکے۔ خصوصاً روس جیسے ملک سے جو کھلم کھلا ہندوستان کے حق میں حقِ تنسیخ استعمال کر چکا ہو اور اقوامِ متحدہ کی کارروائیوں کو کالعدم بنا چکا ہو۔ اس تنسیخ کے خلاف امریکہ اور برطانیہ مجبورِ محض تماشائی بنے رہے۔ حالانکہ مسئلہ پیدا کردہ ہے برطانیہ کا جسے پیچیدگی سے ملوث امریکہ نے کیا۔ پاکستان کے نمائندوں نے ایک سے ایک تقریریں کیں۔ مگر قوالی سے مسائل حل نہیں ہوتے۔

کشمیر کا مسئلہ اتنی طویل مدت سے اقوام متحدہ کے ایجنڈوں کی زینت اسی لئے بنا رہا کہ برطانیہ ہندوستان کی بساطِ سیاست سے علیحدہ ہو کر دور سے یہ دیکھتا رہے کہ دیکھو میں تو گیا، مگر تم کو چین نصیب کیوں ہو۔

امریکہ کی تجارت کا یہ تقاضہ رہا ہے کہ دنیا میں جہاں کچھ کشیدگی ہو ان کی سرمایہ داری کو اسلحوں کی فروختگی سے نفع پہنچتا رہے۔ اگر قیمتاً یہ اسلحے نہ خریدے جاسکیں تو ادھار۔ امداد اور کمیونزم کے خلاف استعمال کے لئے بہانہ تراش کر بھیجا جائے۔ اور اس احسان کے بدلے اس ملک کی معیشت پر بوجھ ڈالا جائے

اور مجبور کیا جائے کہ امریکہ ان پر اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی طور حاوی رہے بدقسمتی سے جن ممالک کو امریکہ نے امداد دی ہے وہاں اندرونی انتشار، سیاسی بحران اقتصادی بدحالی۔ افراطِ زر کے سائے ضرور جلوہ فگن رہے ہیں۔

چین سے شروع کیجئے۔ اس نے جب امریکہ کو خیرباد کہا تب ہی ترقی کی راہ پر ابھرا ہے۔ کمبوڈیا اسی چکر میں گرفتار رہا۔ کانگو کا مسئلہ امریکن دست وبرد سے برباد ہو رہا ہے۔ کوریا کی جنگ امریکنوں کی پیدا کردہ ہے۔ پاکستان کی سیاست گردی ان کی مرہونِ منت تھی۔ اب ان کی توجہ ہندوستان کی جمہوریت نواز قیادت پر ہے جہاں اب قحط بھیانک روپ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ عوام کو گیہوں اور جنگی ناخداؤں کو اسلحے دھڑا دھڑ بھیجے جا رہے ہیں تاکہ عوام اس کے عادی ہو جائیں اور حکومت اسلحوں کے بل بوتے پر ہر کمزور پڑوسی پر دھاوے بولتی رہے۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ کب تک چل سکتی ہے۔

ہندوستان و پاکستان کی جنگ عبرت ناک۔ شرمناک اور انتہائی افسوسناک ہے۔ چند برس پہلے یہ دونوں ملک ایک تھے۔ کروڑوں انسان ایک دوسرے سے مختلف رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ تقسیم اگر ہو ہی گیا تو مل کر رہ سکتے تھے۔ اختلافات اگر تھے تو وہ طے کرائے جا سکتے تھے مگر کون ہے جو آگے بڑھے۔ یہ سہرا روس کو حاصل ہوا اور روس کے وزیراعظم نے جو کارنامہ انجام دیا اس سے اقوامِ عالم کی آنکھیں کھل جانی چاہیئں۔

کشمیر کی لڑائی کے دوران روس کی دعوت ملی۔ تاشقند میں ۴ر جنوری ۱۹۶۶ء سے گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ پس منظر کشمیر ہی رہنا چاہیئے۔ اب آیئے اعلان۔

سارے جھگڑے پرامن طور پر طے ہوں۔ فوجوں کی واپسی ۲۵ر فروری تک اُس مقام پر ہو جائے جہاں وہ ۵ر اگست کو تھیں۔

بائی کمشنروں کی دوبارہ اپنے اپنے عہدوں پر واپسی وغیرہ وغیرہ

یہ اعلان بذاتِ خود دستاویز جیسی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی جگہ پر رہنماؤں کی بصیرت ہوشمندی تدبّر کی نمایاں مثال ہے۔

دونوں ممالک کی لڑائی سے آج تک کس کا فائدہ ہوا ہے؟

کشمیر کا مسئلہ جنگ کے پہلے اور بعد سلجھنے کی طرف کبھی بھی اتنا مائل نہیں تھا جتنا اب ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ یہ غلط ہے تو صحیح کیا ہوتا۔ پاکستان کشمیر لے کر تاشقند سے واپس چلا آتا اور ہندوستان شکست خوردہ لوٹتا۔ کیا یہ ممکن تھا۔ ہندوستان کی وسعت کا اندازہ لگائیے۔ اور اس کی شکست خوردگی کا احساس ملاحظہ فرمائیے۔ ہندوستان کا بڑا سے بڑا لیڈر اس طرح ناامید لوٹ کر صحیح سلامت زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے ماحول کا پرسکون ہونے تک انتظار ضروری ہے۔

آمدورفت کا سلسلہ بحال ہو۔ جو تناؤ ہے وہ کم ہو۔ پھر گفتگو کا آغاز ہو۔ مسئلہ کشمیر کو امن کے پس منظر میں دیکھنے کا موقع ہاتھ آئے۔ اِن باتوں کی شہادت کے لئے روس کا وزیر اعظم مسٹر کوسیجن جس کی انتھک کوششوں سے یہ سلسلہ گفت وشنید کا آغاز ہوا خدا کرے زندہ رہے اور اپنی محنت کا ثمرہ کامیابی کی صورت میں دیکھنا نصیب ہو آمین۔

اس کی اہمیت اور بھی بہت زیادہ ہے جبکہ آنجہانی شاستری وزیر اعظم ہند بدقسمتی سے معاہدہ پر دستخط ہوتے ہی تاشقند میں ہی فوت ہو گئے۔ ان کی ناگہانی موت سے ایک فریق بالکل ہی گفت وشنید کو کالعدم قرار دے سکتا تھا۔ مگر اندرا گاندھی نے وزارتِ عظمیٰ سنبھالتے ہی اس کا اعادہ کیا کہ وہ تاشقند سمجھوتہ کو عملی جامہ پہنانے کی انتھک کوشش کریں گی۔ یہ فال نیک ہے اور اب تک ہندوستان نے پاکستان کے بار بار اعلان کو جو کشمیر کے سلجھاؤ کے سلسلے میں پاکستان تاشقند سے لے کر آج تک

دہراتا رہا ہے۔ رد نہیں کیا ہے۔ اور نہ یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ کشمیر ہندوستان کا جزو لاینفک ہے جیسا کہ سابقہ رویہ ہندوستان کا رہا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی دوستی ضروری اور قدرتی ہے۔ دشمنی عارضی اور بے محل ہے مگر تقسیم کے بعد سے اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکا۔ دوستی سے کیا کیا فائدے ہوں گے اس کا اندازہ بہت ضروری ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہوگی کہ تقسیم کی تلخی ختم ہو جائے گی۔

دوسری بات جو لازمی طور پر نمایاں ہوگی وہ اقلیتوں کا اعتماد ہے جو حکومت پر آج تک بیانات کی بے رنگاپن سے قائم نہ ہو سکا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقلیتیں غیر مطمئن اور مظلوم رہی ہیں۔ ان کا کوئی گناہ نہیں تھا۔ یہ اتفاقی طور پر اس طرف یا اس طرف رہ گئیں۔ جس میں ان کا نہ کوئی دخل تھا اور نہ اس سے مفر کی کوئی صورت۔

اقلیتوں کی بربادی۔ غارت گری اور کس مپرسی شرمناک ہے۔ ایسی حکومت کو نہ مہذب کہا جا سکتا ہے اور نہ لادینی یا دینی ہی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں انسانیت سوز مظالم روا رکھا جائے اور ڈھنڈورا چار دانگ عالم میں نہ پیٹا جائے کہ وہ انصاف پسندی اور معقولیت پر گامزن ہیں۔ گاندھی جی نے جو سبق ہندوستان کو پچاس سال تک عدم تشدد کا دیا تھا اور جس کی بنیاد پر ہندوستان کا نقشہ دنیا والوں کے لئے بڑا ہی سہانا اور دلپذیر تھا۔ وہ ہندوستان کے غلط اقدامات جو اس نے حیدرآباد۔ جوناگڑھ۔ گوا۔ کشمیر پر روا رکھے منہدم ہو چکے ہیں۔ اب ہندوستان کا طرۂ امتیاز عدم تشدد کی بجائے ننگی بہیمیت کی شکل میں نمایاں ہو چکا ہے۔ اس لئے زیادہ دنوں تک دنیا اس فریب کا شکار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اقوام عالم نے ہندوستان کو اس کسوٹی پر جانچنا شروع کر دیا ہے۔ جو اس نے اٹھارہ سالہ دورِ حکومت میں قائم کیا ہے۔ گوا

پر حملہ کے بعد ہی اقوامِ متحدہ میں امریکہ اور انگلینڈ نے جو کڑی نکتہ چینی کی۔ اس سے ہندوستان نہ صرف یہ کہ بے نقاب ہو گیا بلکہ اکیلا بھی ہو گیا۔ چین پر حملہ جو سنہ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان نے کیا۔ اور شکستِ فاش کھائی۔ اس سے اس کی عظمت خاک میں مل گئی اس لئے ہندوستان نہ اب عدم تشدد پسند ہے اور نہ سیاسی اور فوجی طاقت کا مرکز وعظ تو پنڈت نہرو نے خوب کیا مگر چین سے جنگ کے بعد اُن کا وعظ یک بیک بند ہو گیا۔

ان تمام حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہندوستان اپنی حقیقت کو سمجھے تاکہ دنیا میں کوئی باعزت مقام اس کی آبادی اور وسعت کے اندازہ کے مطابق مل سکے جتنا جلد ہندوستان کے اہلِ اقتدار سمجھ لیں اتنا ہی امن عالم کو تقویت ہو اور سانس لینے کا موقع ہاتھ آئے۔

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے رہنماؤں میں یہ تضاد کیوں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ صدیوں کی غلامی کے بعد ہندوستان ابھرا۔ آزاد ہوا۔ طویل غلامی کے ادوار نے انہیں ان تصورات کو بروئے کار لانے پر آمادہ کیا جو اس کی گزشتہ عظمتوں کو فاتحین نے روند کر رکھ دیا تھا۔ قوموں کا عروج و زوال ہوتا ہے مگر اتنی طویل مدت غلامی کی کسی قوم نے نہیں پائی۔ افریقہ والے غلام ہوئے سو دو سو برس میں ابھر آئے۔ عرب والے ڈوبے تو پھر اسی انداز سے جُوا اتار کر زندہ قوموں کی برادری میں شامل ہونے لگے۔ ایران پھسلا تو پھر سنبھل گیا۔ ترکی مصیبتوں میں غوطہ زن رہا۔ مگر سر نکالے رہا۔ برما۔ سیلون۔ جنوب مشرق۔ ایشیا کے ممالک وغیرہ کے ایام سپردگی بھی لگ بھگ ایک صدی یا دو صدی ہی سمجھ لیں۔ مگر ہندوستان کی آبروریزی سکندر اعظم سے لے کر وقفہ وقفہ کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہی۔ آخر اس کی وجہ ؟ وجہ میرے خیال میں عدم رواداری ہے جس نے ان کے مختلف عناصر کو کبھی

یگانگت اور ہم آہنگی نہیں بخشتی۔ آج تک اس قوم کا یہی حال ہے۔ یہ ظاہری یا وقتی طور پر جو ملک میں اتحاد ہے۔ وہ پاکستان دشمنی یا مسلم کشی پر مبنی ہے۔ جس دن وہاں کے عوام پاکستان سے مطمئن ہو جائیں گے ان کو منتشر ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

اعلانِ تاشقند سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ہند و پاک کے خوشگوار دور کا آغاز آسام سے مسلمانوں کی بید خلی کا سدِّ باب۔ مسلمانوں پر مظالم میں عام تخفیف۔ سرحدی امن و امان اور سب سے بڑا مسئلہ کشمیری عوام کے لئے نئے پیغام کی مبارکبادیاں۔ خدا کرے یہ سارے کے سارے حل ہو سکیں۔

ہندوستان نے بھی اعلانِ تاشقند پر دستخط کئے ہیں۔ جس دن سے یہ اعلان ہوا ہے ہندوستانی رہنما کشمیر کو ہندوستان کا جزوِ لاینفک نہیں کہہ رہے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ روس نے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کو لیڈروں کی ملاقاتِ تاشقند سے پہلے یہ زور دے کر آگاہ کر دیا تھا کہ اٹوٹ بولنے سے کوئی حاصل نہیں۔ اور ایسی صورت میں ملاقات ہی غلط ہو جائیگی اس لئے تدبر سے کام لیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہندوستان وقت کی رفتار میں پناہ لے رہا ہو اور تاشقند اعلان کو عملی جامہ پہنانے میں اتنی تاخیر کرے جو مزید اٹھارہ سال کی مدت کے لگ بھگ ہو۔ اس سے اعلان پر دستخط کنندگان برسر اقتدار ہی نہ رہینگے جو کوئی موثر آواز اٹھا سکیں۔ پھر یہ اعلان نہرو کے اس اعلان کی طرح کالعدم ہو کر رہ جائے گا۔ جو انہوں نے کشمیریوں کو حق خود ارادی دینے کے لئے ساری دنیا کو گواہ بنا کر کہا تھا۔ ہندوستان کی سابقہ قلابازیوں سے یہ قیاس آرائیاں بعید از قیاس نہیں۔

اب وزارتِ عظمیٰ پر نہرو کی صاحبزادی براجمان ہیں۔ انہوں نے مسندِ وزارت پر آتے ہی یہ کہا ہے کہ ہندوستان اپنی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھے گا۔ ابھی انہوں

نے صاف صاف یہ نہیں کہا ہے کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہے۔ ہاں یکم فروری ۱۹۶۶ء کو دہلی میں جو عام جلسہ ہوا اس میں سردار سورن سنگھ اور چاون نے غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ ہی دیا کہ کشمیر ہندوستان کا جزوِ لاینفک ہے۔ اب دُھرا ہی کیا رہ گیا۔

مگر جو کچھ کہا جائے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان خوب سمجھ رہے ہیں کہ معاہدۂ تاشقند کیا ہوا۔ اگر کچھ امید بندھتی ہے تو وہ روس کا صلح کُن کردار ہے۔

جو اس نے تاشقند گفتگو میں شروع سے آخر تک دکھایا۔ ہندوستانی عوام ناراض ہیں کہ کشمیر کا لفظ گرچہ کتنا ہی مہمل ہو کیوں آیا۔ پاکستانی عوام اس لئے ناخوش ہیں کہ کشمیر کا تذکرہ اتنا سرسری کیوں ہوا۔ مگر الفاظ سے کہیں سر نہیں ٹوٹ سکتے اب دیکھنا ہے کہ اس گفتگو کے کامیاب بنانے میں کون کتنی دوراندیشی سے کام لیتا ہے ورنہ مستقبل تاریک ہے۔

اعلانِ تاشقند کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ روس جس نے اقوامِ متحدہ میں ہمیشہ حق تنسیخ استعمال کیا یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ انگریزوں کا پیدا کردہ ہے جس کو امریکہ نے اسلحہ فروشی کے لئے الجھا کر رکھ چھوڑا ہے۔ اس سے امریکہ کے دو فائدے ہیں۔ ایک تجارت میں فروغ۔ دوسرے برصغیر میں اس کے اثر و رسوخ میں ثبات۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس کی دلچسپیوں سے امید کے پہلو زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔

زیکوسلویکیا

(Czechos Lavakia)

برطانوی سامراجیت کا جنازہ اٹھ کر مدفون ہو چکا۔ تو امریکہ نے جدید شہنشاہیت کا ڈھونگ رچایا۔ اس کی صورت فوج کشی کے بدلے "امداد کشتی" کہا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔ امداد دینے والا محسن امداد لینے والا ممنون ہوتا ہے۔ مگر جہاں امداد کا منشا سیاسی مداخلت ہو وہاں اس امداد سے وقت گزرنے کے بعد تنفّر، بیزاری اور بغاوت کے سوا کچھ نہیں حاصل ہوتا۔

امریکی امداد چیانگ کائی شیک۔ پاکستان۔ ہندوستان۔ ویت نام کے علاوہ کون ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ نہ لے رہا ہو۔ مگر ہر جگہ امریکہ سے کھچاؤ میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ امریکہ کے سارے دعوے۔ امن۔ عدم مداخلت۔ امداد۔ فوجی حفاظت سب منہدم ہوتے گئے۔ کیونکہ آزاد دنیا کی صحیح طور پر اپنے اعمال سے محبت کی یقین دہانی نہ کرا سکا۔

دوسری طرف روس دکھی دنیا کی پشت پناہی کا بیڑہ اٹھا کر سامراجیت کے خلاف ابھرا تھا۔ سنہ ۱۹۱۷ء سے آج تک اس کے کردار اور گفتار میں بے حد تضاد رہا۔ اس کی لادینیت کا خلاصہ انسانیت کی محبت بتلایا جاتا تھا۔ مگر اس کی عیاریوں سے نہ چین کو چین مل سکا۔ نہ مشرقی یورپ کے چھوٹے ممالک اس کی نگاہِ ہوس آلود سے مامون رہ سکے۔ بارہ سال پہلے ہنگری پر قیامت توڑی تو آج زیکوسلویکیا اس کی شرمناک حرکتوں سے بے جان ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۶۸ء کی صبح نے زیک کی بہادر قوم کے لئے بجائے پیغام نسیم بادِ سحری کے

بادِ صرصر اور تمازت لائی جو توپوں کی گھن گرج کے ساتھ آئی۔

الکزینڈر ڈوبک ALEXANDER DUBECK جو ملک میں اصلاح آزادیٔ گفتار و تحریر کے حامی تھے۔ ان سے روسی خوش نہیں تھے۔ گفتگو جو چند دن پہلے ختم ہو چکی تھی۔ ایک طرح کا تعطل تھا چند دنوں بعد معاہدۂ وارسا کی قوموں کا سہارا لے کر روس نے زیک کا گلا گھونٹ دیا۔ زیک صدر ماسکو لے جائے گئے ہیں ان کا خدا حافظ ہے۔ ڈوبک کے بارے میں خاموش ہے۔ ملک ملٹری کے جوتوں کے نیچے کچلا جا رہا ہے۔ آزادی کا مفہوم امریکہ والے ویت نامیوں کو سکھا رہے تھے۔ اب دوسرا سبق روس نے زیک قوم کو سکھانا چاہا ہے۔ جس پر امریکہ۔ انگریز اور فرانس بلکہ ساری مغربی دنیا چیخ و پکار کر رہی ہے۔

اقوامِ متحدہ کی کونسل بلائی گئی۔ وہاں حقِ تنسیخ روس نے استعمال کیا۔ جس کو مرنا تھا مرگیا۔ اب کفن چوروں کی مجلسِ شوریٰ سے زندگی تھوڑے ہی واپس مل سکتی ہے مگر یہ بات ضرور ہے جو قوم زندہ رہنا چاہتی ہو اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔ وقتی طور پر مصائب سے وہ دوچار ہو سکتی ہے مگر اس کا ابھرنا ضروری ہے۔ برطانیہ نے اپنی بساطِ سیاست لپیٹ دی ہے۔ امریکہ کا حشر عنقریب برطانیہ جیسا ہوگا۔ روس بھی اپنے کئے ہوئے گناہوں کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ دعا ہے خدا کوئی ایسی قوم پیدا کرے جو مظلوم دنیا کو عدالت کا سبق پڑھا سکے۔

اب تک زیکو سلوکیا کی قسمت کا صحیح خدوخال دنیا کے سامنے نہیں آسکا ہے گفتگو ماسکو میں ہو رہی ہے۔ روسی فوجیں اپنے اتحادیوں کے ساتھ پراگ پر قابض ہیں ہر قابض اپنی طاقت کا لوہا منوانے کے لئے تشدد و بربریت پر اتر آئی ہے۔ وہاں کے مجبور عوام کس طرح کچلے جا رہے ہیں۔ باہر کی دنیا کو خبریں بہت کم مل رہی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ فوج کشی کا مطلب ہی یہ ہے کہ سبق سکھایا جائے تاکہ وہاں کے عوام جن کے

دماغ میں آزادی کا سودا ہے وہ اپنی اس آزادی سے محروم ہو جائیں۔ رعب کھا کر سارے جذبات کافور ہو جائیں۔ مگر یہ وہ نشہ ہے جس کو دبانا۔ کچل دینا۔ یا بالکل فنا کر دینا بذاتِ خود جنوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

انگلینڈ میں کل بڑا احتجاج منایا گیا۔ روسی سفارت خانہ پر جلوس پہنچا۔ نعرے لگائے گئے۔ کچھ لوگ گرفتار ہوئے۔ مجمع منتشر کر دیا گیا۔ آج پارلیمنٹ کا ہنگامی اجلاس بلایا جا رہا ہے۔ تقریریں ہوں گی۔ مباحثے ہوں گے۔ تجاویز پاس کی جائیں گی۔ پھر خاموشی کا دور دورہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اور انگریز کیا کر سکتا ہے۔

امریکہ ویت نام میں پھنسا ہوا ہے۔ دوسرے صدارتی انتخاب کا ہنگامہ ہے۔ ابھی وہ اس موڈ میں نہیں ہے کہ کوئی قدم اٹھا سکے۔

رومانیہ۔ بلغاریہ۔ اپنی جان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ہندوستان کے لوک سبھا میں تقریریں ہوئیں۔ جن میں کہا گیا کہ روس کا یہ اقدام غلط ہے۔ ظلم پر مبنی اور نہایت جابرانہ ہے۔ ہندوستان نے سیکورٹی کونسل میں روس کو نہ مذموم ٹھیرایا اور نہ اس کے خلاف ووٹ ہی دیا۔ کیونکہ یہ دونوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ روس کی مدد بھی ملتی رہے امریکہ مع اپنے زیرِ اثر ملکوں سے ناراض بھی نہ ہو۔ بین الاقوامی سیاست میں وقتی طور پر یہ عیاری کامیاب ہو جائے تو ہو جائے مگر اصل میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کا رویہ میرے خیال میں مصلحت کوشی پر مبنی سمجھا جاتا ہے مگر حق گوئی سے پہلو تہی برتنا کبھی راس نہیں آ سکتا۔ روس کی خوشی تو حاصل کی جا سکتی ہے مگر خدا کی ناراضی کا احساس ضرور نظر آنا چاہیے۔

دشمنوں نے اپنے زیرِ دستوں کو برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر زبردست دشمن ہمیشہ زبردست نہیں رہ سکتے۔ روس نے زیک پر فوج کشی کر کے وقتی طور پر تو لطف اندوزی حاصل کر لی ہے۔ مگر ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جب ان پر یہ آفت کسی اور

طرف سے بھی آسکتی ہے۔ آج ہٹلر، مسولینی۔ ٹوجو کہاں ہیں۔ اسٹالن کی عجیب شخصیت اس کے زبردست کارنامے حرفِ غلط کی طرح اسی کے اپنے لوگ کس طرح مٹا رہے ہیں۔ آئندہ کے مورخ اس باب میں کبھی نہ مصلحت اندیشی سمجھیں گے۔ اور نہ ہی ان کے ظلم و تشدد کو پسندیدگی کی نگاہوں سے پیش کریں گے۔

روس نے اس اقدام سے اپنی تہی دامنی کا ثبوت دیا ہے۔ ہر وہ فعل جس کو پراگ کے عوام ناپسند کریں۔ ناپسند قابل مذمت ہے۔ حق تنسیخ استعمال کرنے سے نہ کشمیر کا مسئلہ مر سکا اور نہ پراگ کے عوام پر موت کی نیند غالب آسکتی ہے۔

زیک لیڈر روس سے گفتگو کے بعد واپس بھیج دیئے گئے۔ وہاں کوئی معاہدہ ہو گیا ہے جس پر الگزینڈر ڈوبک وغیرہ نے دستخط کر دیئے۔ مگر دل پر دستخط ظلم و ستم کے بل بوتہ پر نہیں کیا جاسکتا۔

سلہٹ

۲۱ر جون ۵۹ء

متفرقات

بارہا کوشش کی کہ ڈائری یا روزنامچہ کی شکل جاری رہے۔ مگر تھوڑی سی غفلت سے ایکدن کا وقفہ بھی یوں مہلک ثابت ہوا جیسے بلندی پر چڑھنے والوں کے لئے ایک زینہ کی عدم موجودگی۔ خیالی تسلسل ٹوٹا اور سارا معاملہ تارِ عنکبوت کی طرح درہم برہم ہوگیا۔

طالب علمی کے وقت سے میں نے روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ برسوں جاری رہا ملازمت ہوئی۔ بے روزگاری گزری۔ سفر درپیش ہوا۔ وقت کی کمی نے مجبور کیا۔ مگر پھر شروع ہوا۔ اس دفعہ برسوں کے بعد آج تہیہ کئے لکھ رہا ہوں کہ اب جاری رکھوں گا دیکھنا ہے کہ یہ تہیہ کب تک قائم رہتا ہے۔ سلسلہ ٹوٹ جانے کے بعد جب کبھی ضمیر نے ملامت کیا کہ برا ہوا۔ پھر شروع کیا جائے تو دل نے بہت سے بہانے تراشنے شروع کر دیئے۔ کبھی اچھے کاغذ کی عدم موجودگی۔ کبھی قلم کی شکایت۔ کبھی گرمی اور جاڑے کی شدت۔ غرض ایک نہ ایک حیلہ دل کو منانے کا دماغ نے نکال ہی لیا۔ اور پھر معاملہ یوں طے ہوا کہ کل پر رکھو۔ کل ہوئی۔ پھر دوسری صورت نکل آئی۔ اسی لئے عقلمندوں نے کہا ہے کہ جو کل کرنا ہے آج ہی کر لو۔ کل نے بڑے بڑے خیالات کو کالعدم کر دیا ہے۔ دنیا کے اکثر لوگ جو قسمت کا گلہ کرتے ہیں وہ اسی "کل" کے مقتول ہیں۔

بہرحال اب یوں شروع کرتا ہوں:۔

اتوار کا دن بڑا بے کیف گزرا۔ دوکان کی مشغولیت آج ختم ہوتی ہے تو دوسری

طرف کوئی دروازہ ایسا نظر نہیں آتا۔ جہاں دل بستگی کا کوئی ذریعہ میسر آجائے۔ قحط الرجال ہے۔ دن کاٹے نہیں کٹتا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ فطرت واسطی صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب "وفا راشدی" آئے۔ تعارف ہوا اور بڑی خوشی ہوئی کہ یہ وفا راشدی باوجود اپنی ملازمت کی مشغولیتوں کے علم و ادب کا بڑا شوقین ہے۔ وفا صاحب کے نام سے میں واقف تھا۔ مگر شرفِ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بڑی خوشی ہوئی۔

وفا صاحب آدمی سادہ۔ بے تکلف خالی از تصنّع ہیں۔ ان کی ایک کتاب "بنگال میں اردو" بڑی مقبول اور مفید ہے۔ میں نے اس کا نام سنا ہے خواہش ہے کہ پڑھوں چنانچہ میں نے وفا صاحب سے دوسرے دن کہا کہ اس کتاب کو قیمتاً آپ کراچی پہنچکر ہمیں بھیجدیں۔

سلہٹ

۲۴ جون ۵۹ء

اِن دنوں حکومت کی توجہ زیادہ تر چاء کی کاشت اور اس کی تجارت پر مرکوز ہے۔ یہ ملٹری دور ہے۔ یہ سادہ لوگ ہیں۔ ہر وہ رائے جو ان کی نظروں میں مخلصانہ اور مفید ہو دوسرے دن قانونی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی چاء کے ساتھ ہوا۔

چاء کی کاشت پاکستان میں صرف سلہٹ میں ہوتی ہے۔ کچھ چاٹگام میں بھی ہے۔ لیکن برائے نام۔ اس میں اکثر غیر ملکی (یوروپین) ہیں۔ ان کے باغات بڑے اچھے اور حقیقتاً دلکش ہیں۔ میلوں میل چاء کے شاداب و پرکیف پودے جو بلندی میں چار فٹ کے قریب ہوتے ہیں۔ پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ایک پودے کی تاریخ ہے جو نسلاً بعد نسل محفوظ رکھی جاتی ہے۔ ہر سال جو کار آمد پتے (ڈھائی ٹو سے) اس

لئے گئے۔ اس کی مقدار۔ اور پھر اس سے جتنی چاء تیار کی گئی اس کا وزن قلم بند رکھا جاتا ہے۔ مرکزی حکومت فی پونڈ دو آنے اکسائز ڈیوٹی ۲۹ اپریل ۱۹۵۹ء تک لیتی رہی۔ اب انقلابی دور شروع ہوا۔ ۲۹ اپریل سے ڈیوٹی بجائے دو آنہ کے چھ آنے پونڈ کر دی گئی۔ خرید و فروخت پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ یعنی اب کل چاء نیلام کے لئے چاٹگام جایا کرے گی اور وہاں فروخت ہو گی۔ پہلے یہ آزاد تھی اور ان تمام قید و بند سے بے نیاز۔

اب یہ حکومت کی منظور نظر ہو کر عام اشیاء تجارت کی طرح بازاری نہیں رہی بلکہ حجرہ نشیں ہو کر اپنی قیمت کی بولی بلواتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے اس کی عزت کو چار چاند لگ گئے۔ مگر کاروبار ماند پڑ گیا۔

کاروبار کا اصول ہے کہ تمام پابندیوں سے محفوظ ہو۔ اب یہ قید و بند میں جکڑی ہوئی کالی پری ہے۔ مقامی طور پر باغبان اپنی متاع عزیز کو بیچنے کی صلاحیت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اب وہ تمام اخراجات کے کہاں تک متحمل ہوں گے۔ خدا بہتر جانتا ہے۔

اس سے اس تجارت کو کافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حکومت کی توجہ میں یہ باتیں لائی گئی ہیں۔ مگر پہلا نقش زیادہ دیرپا ہوتا ہے جب تک کہ وہ نہ مٹ جائے ادھر رخ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس کا فیصلہ وقت اور تجربہ کرے گا۔

سلہٹ

۲۵ جون ۵۹ء

ان دنوں کساد بازاری ہے۔ چاء پر پابندیوں کے بعد ہمارا کاروبار ٹھنڈا ہے مشغولیت کم۔ بیکاری زیادہ۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ زندگی ایک بوجھ اور ذی حس

انسان کو اس کی شدت وبالِ جان سے کم نہیں ؎

بیچارگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

شاید غالب نے انہی بے بس لوگوں کے لئے یہ شعر کہا ہو۔ مگر اس آبادی میں دیواریں تو بہت ہیں مگر سر ٹیکنے کا موقع نہیں۔ انسان اگر سر دے کر بھی سکون حاصل کرے تو جوشِ جنوں میں آگے بڑھنے والوں کی تعداد مفقود نظر آتی ہے۔ پھر سر بھی دیا جائے تو خوشی جب ہو کہ یہ سر دوسروں کے کام آئے۔ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اگر سر دیا جائے تو یہ خود غرضی ہو گی۔ خیالات کے انبار ہیں جو انسان کو بہت سی لغزشوں سے روکے رہتے ہیں۔ اگر یہ بوجھ بھی کم ہو جائے تو پھر ابنِ آدم بجائے اشرف المخلوقات ارذل ہو جائے۔

بہر حال زندگی اگر کاٹے نہ کٹے تو بے لطف ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ صبح و شام کی جدائی نظر نہ آئے۔ مشغول رہنا بھی ایک نعمت ہے لوگ کام سے بھاگتے ہیں مگر اپنا تو یہ حال ہے کہ کام مجھ سے بھاگ رہا ہے۔

زندگی مشغولیت سے لبریز ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا

سب سے بڑا نفسیاتی پہلو اس مشغولیت کا یہ ہے کہ وقت کی قدروں کو انسان سمجھنے لگتا ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے۔

آج خان ٹی اسٹیٹ کا دوسرا ویگن ایکشن کے لئے چاٹگام تک ہونے والا بھرا ہوا ٹرک گارڈن سے نکلا اور راستہ جو بارش کی وجہ سے عارضی منٹوں سے اونچا نظر آرہا تھا ٹرک کو اپنے دامن میں لے کر بیٹھ رہا۔ بڑی دقتوں سے باہر کیا گیا۔ ساڑھے سات بجے شام کو سلہٹ پہنچا۔ مال اسٹیشن پر رکھ دیا گیا۔ خدا کرے محفوظ رہے۔ آمین

کچھ دیر کے لئے یہ بھی مشغولیت تھی مگر باعث خلجان۔ کیونکہ ریلوے کا "بابو" اپنی جگہ ایک پہاڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حصہ میں وہ بلا شرکتِ غیرے حاکم وقت ہے۔

اس کی نیم باز آنکھوں کی حرکت بیوپاریوں سے کچھ اور کی طالب ہوتی ہیں۔ بیوپاری اپنے معمول سے ہٹنا نہیں چاہتا۔ مگر اس خاموش حاکمانہ فریاد کو ٹھکرا دینا بھی اس کے بس کا روگ نہیں۔ قہرِ درویش بہ جانِ درویش۔ آگے بڑھ کر وہ بہت جلد اپنی گدّی کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ پھر وہ ہتھیار رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کاروبار نام ہے پیسہ کمانے اور لٹانے کا۔ یہ نام ہے قانون کے ہر داؤ کو نفرتی ٹھوکروں سے عبور کرنیکا کاروباری قانون سے لڑنا نہیں جانتا۔ بلکہ قانون سے بچنا جانتا ہے۔ یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔

سلہٹ

۳؍ جولائی ۱۹۵۹ء

یکم جولائی کو چاء کی نیلام تھی۔ میں ۲۹؍ جون کو عزیزم شمیم سلمہ کے ساتھ چاٹگام کے لئے روانہ ہوا۔ ۳۰؍ جون کو نمونے دیکھے اور یکم جولائی کو نیلام ہال خریداری کے لئے گیا نیلام مکمل نہ ہوسکا۔ اور یہ چاء کی تاریخ میں پہلا اتفاق تھا کہ بولی ختم ہو جانے کے بعد ڈاک بولنے والے پلٹ جانے کی کوشش میں ہوں۔ کیونکہ اس میں کاروباری سُبکی اور اصول تجارت کے خلاف انتہائی رسوائی ہے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ حکومت کی منفی پالیسی اور فضول مداخلت ہے۔ ملک میں چاء کی کمی نہیں ہے۔ برآمد کا کوٹا ہر چاء باغ کا مقرر کر دیا گیا ہے وہ برآمد ہوگا۔ اندرونِ ملک جو چاء ہے یا تو فیکٹری سے نکلتے ہی قیمت مقرر کر دی جائے اور آکشن کو بند کرا دیا جائے یا خرید و فروخت کے بنیادی قانون پر چھوڑ دیا جائے۔ لیت و لعل سے حکومت کہاں چلتی ہے۔ جس نے بڑھ کر ہاتھ مارا اُسی کی دہائی ہے۔ حکومت اگر چاہے تو سب ہو سکتا ہے بہتر صورت یہی ہے کہ کم سے کم مداخلت ہو۔

سلہٹ

۵ر جولائی ۱۹۵۹ء

آج اتوار تھا۔ صبح حسبِ معمول اٹھنے کے بعد غسل وغیرہ سے فارغ ہوا۔ اور روزگار کی جستجو شروع ہوئی۔ پہلے مل گیا۔ جہاں کچھ چائے کاٹنے کے لئے بھیجی گئی ہے واپس آیا۔ کھانا کھایا۔ سونے کی کوشش کی۔ مگر بچوں کی ہماہمی اور ان کے شور وغل سے نیند نہ آسکی۔ عصر کی نماز مسجد میں ادا کی۔ واپس گھر آیا تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو موجود پایا۔ ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ مذہب پر گفتگو چھڑ گئی۔ دماغی صورت اب یہ ہے کہ مذہب کی ہر ظاہری شکل اور مذہبی لوگوں کی ہر تصنع بازی سے نفرت کا جذبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ مذہب کا خلاصہ اور اس کی روح انسانیت کی بھلائی ہے۔ جس مذہب کے دعویداروں میں یہ اسپرٹ مفقود ہو وہ صرف دھوکہ ہے۔ ایک کافر (جس کو مسلمان کافر کہتے ہیں) اگر اخلاقاً انسانی جذبہ سے معمور، محلہ والوں کے لئے باعثِ رحمت۔ خاندان کے لئے ممد ومعاون۔ غریبوں کی مدد اس کا شیوہ ہو تو وہ انسانیت کا نمونہ اور تخلیقِ خدا کا مجسم پیکر کیوں نہ سمجھا جائے اور وہ کیوں ناری ہو۔

برخلاف اس کے ایک مسلمان، نمازیں پڑھنے والا۔ ظاہری شکل وصورت، رسمی مسلمان جیسی۔ مگر خاندان کے لئے مصیبت، چنگیزی قلب۔ غریبوں کے لئے ناامیدی کا بت۔ وہ صرف اس لئے جنتی ہوگا کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے۔ مگر اسلام کیا۔ انسانیت کا کوئی عنصر اس میں موجود نہیں۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔ خدا نے فرمایا ہے کہ میں رب العالمین ہوں۔ وہاں تو اس کی ربوبیت محدود نہیں ہے۔

پیغمبرِ اسلام نے فرمایا۔ تم میں بہتر وہ ہے جس سے لوگوں کو فائدہ ہو۔ دوسری جگہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے کہ حسنِ اخلاق کی تکمیل ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے عموماً اور مسلمان کے لئے خصوصاً اخلاق

اخلاق کا پیکر ہونا سب سے بڑی علامت ہے۔ مگر بدقسمتی سے مسلمان خصوصاً پیشوایانِ اسلام اس بنیادی نقطہ سے بہت دور ہیں۔ اسی لئے ہماری عظمت کا آفتاب بہت ہی مدھم ہے۔ اس کی گرمی ایسی نہیں جو قلب و روح کو گرما دے۔

اسلام کتابوں سے اور مواعظ حسنہ سے نہیں پھیلا۔ اسلام اچھے اخلاق سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچا۔ جو شخص مسلمان سے جتنا قریب ہوا۔ اس کی عظمت کا قائل ہونا پڑا۔ اگر اس کو نفرت تھی تو وہ بھی محبت کی شکل اختیار کرتی گئی۔

سر ونسٹن چرچل مشہور مصنف اور برطانیہ کا انتہائی پر آشوب دور میں وزیراعظم اس نے لارنس آف عربیہ Laurance of Arabia کی زندگی میں لکھا ہے کہ لارنس کی سربلندی۔ شخصیت اور پر شوکت اوصاف کا اندازہ اسی سے کرو کہ جو جتنا قریب ہوا اس کی محبت اتنی ہی شدید ہوتی گئی۔

اسلام کی اشاعت اور اس کی اتنی قلیل مدت میں صحرائے عرب سے نکل کر اطراف عالم میں پہنچ کا راز کیا تھا وہ پیغمبر اسلام کی غیر فانی قوتِ اخلاق تھی جو آج تک کروڑوں کے لئے مشعلِ نجات ہے۔

ایک صحابی کا مشہور قصہ ہے۔ انہوں نے خود رسولِ پاک سے فرمایا کہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت شخص ہماری نگاہوں میں آپ تھے۔ جب میں نے آپ کو دور سے دیکھا تھا۔ مگر جب سے ہماری ان آنکھوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ آپ سب سے محبوب ترین انسان ہماری نگاہوں میں ہیں۔ یہ تھا وہ جادو جو چیخ چیخ کر بہ بانگِ دہل لوگوں سے کہلواتا تھا۔

آج کیا ہے۔ ہمارے مذہبی پیشوا ایسے ہیں کہ دور سے ان کی پر وقار تصویر جاذبِ نظر ہوتی ہے۔ مگر جتنی قربت ہوئی نفرت کا جذبہ شدت اختیار کرتا جاتا ہے اسی لئے ان مواعظِ حسنہ میں نہ کوئی اثر۔ کشش اور روح ہے بلکہ ایک تمسخر سے کم نہیں۔

وعظ کہنا بڑا آسان ہے۔ لوگوں کو ہدایت کی باتیں سنانا کونسا مشکل کام ہے۔ اگر مشکل ہے تو ان وعظوں پر عمل کرنا۔ اگر ناممکن ہے تو ان ہدایات پر چلنا جس کی تلقین بزرگانِ دین نے کی۔ جنھوں نے اپنی زندگی عمل کے لئے وقف کردی تھی۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

سلہٹ

۱۸ر جولائی ۱۹۵۹ء

انتہائی گرمی ہے۔ دھوپ کی تمازت تو خیر اتنی شدید نہیں، مگر سلہٹ کی روح فرسا اُمسی ہوئی گرمی قلب وجگر کو پگھلا کر بلکہ کمہلا کر پانی کئے دیتی ہے کسی کروٹ چین نہیں اگر دھوپ میں صرف تمازت ہوتی تو سایہ میں سکون ڈھونڈا جاسکتا تھا۔ اگر سایہ میں کچھ کمی ہوتی تو بجلی کے پنکھوں سے اس کمی کو پورا کیا جاسکتا۔ مگر کمی ہے تو اس چیز کی جس پر انسانی طاقت ناز نہیں کر سکتی۔ یعنی وہ جغرافیائی حد بندی اور اس پر قدرتی پابندیاں۔ یہ سرزمین سکون بخش ہو تو کیونکر۔

یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ انسان ہزاروں قدرتی جکڑ بندیوں کے بعد اپنے کو بالکل آزاد سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا سے برسرپیکار اور آمادہ بغاوت۔ شاید اسے یہ احساس نہیں کہ اس کی آنکھوں کو قدرت نے کیوں زمین کی طرف دیکھنے پر مجبور کردیا ہے۔ کیا اس میں طاقت ہے کہ وہ بجائے سرنگوں ہونے کے سربلند ہوسکے۔ سرنگوں تو وہ پیدا ہی کیا گیا مگر اس کو سربلندی کی ہوس نے بندھن توڑنے پر اکسایا اور آج یہ مجبور محض مخلوق بجائے نیچے دیکھنے کے اوپر جانے کی تگ ودو میں غلطاں و پیچاں ہے۔

مزائل چھوڑنے جارہے ہیں تاکہ وہ چاند پر پہنچ کر اڈہ قائم کرسکے۔ شاید اس میں

بھی یہ انسان کامیاب ہو جائے اور وہ زمین و آسمان کا کرتا دھرتا اپنے کو شمار کرنے لگے مگر اس کی بنیادی کمزوریاں اس کا پیچھا وہاں بھی کرتی رہیں گی۔

سلہٹ

۲۶ر جولائی ۵۹ء

آج اتوار تھا اور آرام کا دن۔ سارا دن گھر ہی پر رہا۔ کبھی سوتا رہا۔ کبھی بچّوں سے کھیلتا رہا۔ زندگی بھی ایک بوجھ ہے جس کو کاٹنا آسان نہیں۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے مشغولیت کی ضرورت ہے۔ مشغولیت ایسی ہو جو معاش بھی دے سکے اور تفریح بھی بہم پہنچا سکے اِن حالات کے حصول کی تمناؤں میں انسان اپنے سارے وسائل کام میں لاتا ہے۔ پھر بھی اس کو مقصد سے دوری ہی رہتی ہے۔

دنیا میں کتنی خوش نصیب شخصیتیں ہیں جس کو معاش سے بے فکری ہو اور تفریح سے قربت۔ میرا خیال ہے کہ جواب عدم ہی میں ملے گا۔ نفسیاتی طور پر اگر دیکھا جائے تو ایسی صورت میں انسانی وجود اور اس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بے فکری معاش اور تفریح سے قربت زندگی کا مقصد نہیں۔ زندگی نام ہے جد وجہد کا اور جو زندگی اِن دو لفظوں سے خالی ہو وہ موت کے مترادف ہے۔ ؎

موجیم کہ آسائشِ ما عدم است

ما زندہ از آنیم کہ آرام بگیرم

ہاں اس جد وجہد اور تنازع للبقا کا نام ہی زندگی ہے۔ مگر مقصدِ زندگی یہ نہیں ہو سکتے۔ زندہ رہنا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ زندہ رہنے کے لئے اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ جو قیمت دیکر کوئی چیز حاصل کرتا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی قیمت ادا کرنے والا ہی جانتا ہے۔ اس لئے جس کی قیمت زیادہ ہو اس میں لطف زیادہ۔ اور جب لطف آیا تو پھر زندہ رہنے کا انداز معلوم ہو گیا۔

سلہٹ

۱۷ اگست ۱۹۵۹ء

ہفتوں کی قنوطیت کے بعد آج پھر روزنامچہ لے کر بیٹھا ہوں۔ لکھنے کی طرف طبیعت کا میلان ہی نہیں تھا۔ جب کبھی سوچا کہ سلسلہ منقطع کرنا ٹھیک نہیں تفکرات نے آکر گھیر لیا۔ انقباضی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور سارا سوچا سمجھا معاملہ جس کو دماغ نے تسلسل کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا کافور ہو گیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی کام بغیر سکون قلب کے ممکن نہیں۔

کاروباری زندگی بھی عجیب ہے اس زندگی میں دنیا و مافیہا کی کوئی اہمیت نہیں زندگی کے سارے بندھن کمزور اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ایک ہی چاہ باقی رہ جاتی ہے وہ ہے حصولِ زر۔ اس کے لئے دماغی کاوش۔ خاکہ۔ اس کی کیفیت اور پھر حاصل کرنے کے ہر داؤ استعمال ہونے لگتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو حصولِ زر ناممکن ہے۔ روپیہ حاصل کرنا بڑا مشکل فن ہے۔ اس میں بڑی پسپائی ہے۔ ضمیر کی موت ہے۔ قلب و جگر کے لئے بڑا کٹھن امتحان ہے۔ قلب کی دھڑکنوں میں اضافہ ہے۔ قبل از وقت دل کی بیماری کے لئے دعوت ہے۔ ان تمام قربانیوں کے بعد جو چیز ہم حاصل کرتے ہیں۔ وہ چند پیسوں کے سوا کچھ نہیں۔ ؎

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض

نہیں شعلے دیتے شرر کے عوض

ہمارے ملک میں بیوپار کرنے والی قومیں ہیں۔ انہیں قریب سے دیکھنے کے بعد دو ہی خیالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی پیسوں کے لئے ہے اور دوسری اس کے برعکس۔ مگر تیسری صورت ان دونوں کے بیچ بیچ میں ہے کہ زندگی بھی ہو اور پیسے بھی ہوں۔ مگر اس تیسری صورت کی مثال ہمارے ملک میں نہیں ملتی۔ یہ بیرونِ ملک کے مہذب کاروباریوں کا حال ہے۔

یورپ، امریکہ اور خوش حال مہذب، ملک کے باشندے زندگی کے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے پاس پیسے بھی ہیں اور زندگی کے ساز میں راگ بھی ہے۔ وہ پیسے اس لئے کماتے ہیں کہ زندگی کے بوجھ کو کم سے کم محسوس کیا جا سکے۔ ایسی کیفیت کے حصول کے لئے وہ خوشی کی تلاش میں بھی اسی طرح پا بجولاں ہیں۔ جس طرح دولت کے لئے وہ مضطرب۔

ہمارے ملک کے دولت مند توڑوں پر بیٹھے اضافہ کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ نہ ان کے پاس غریبوں کی مدد کا کوئی ٹھوس پروگرام ہے اور نہ وہ اس دل کے مالک ہیں۔ جو دوسروں کو خوش دیکھنا چاہتا ہو یا جو خرچ کر کے خوشی محسوس کرتا ہو۔ اگر اس بے کسی میں مسلمان طبقہ کی اپیل پر سیلاب زدوں اور دوسرے امدادی کاموں میں حصہ بھی لینا ہو تو وہ پیسے جو اس نے حکومت کو دیئے صحیح طور پر استعمال نہیں ہو سکتے۔ وہ حکومت کی بوسیدہ مشنری میں جا کر برباد ہو جاتے ہیں۔ البتہ حکومت کو خوش کرنا جو اس کی نیت تھی پوری ہو جاتی ہے۔ مگر حکومت کی نیت تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے۔

وجہ ظاہر ہے انسانی ہمدردی کا فقدان اور خدا کو نہ خوش کرنے کا رجحان ہمیں کسی منزل تک نہیں پہنچنے دیتا۔

ظاہرا طور پر مسلمان من حیثیت قوم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا سے قریب تر رہنے کا شرف اس کو حاصل ہے۔ یہ خدا سے ڈرتے ہیں ان میں ہر کام کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا جذبہ ہے۔ مگر اندرونی طور پر یہ قوم اتنی کھوکھلی ہے کہ خدا اس کے قریب تک نہیں پھٹک سکتا۔

کیونکہ اس دعوے کو جب کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اتنی جلد اور اس بے باکی سے یہ قوم خدا کو پس پشت چھوڑ دیتی ہے۔ جیسے خدا کا وجود ہی نہیں۔ یا یہ کہ خدا کا قائل ہی نہیں۔ ہمارے سماجی کام میں خدا ناپید ہے۔ ہماری

شادی غمی میں خدا موجود نہیں۔

ہماری روزانہ کی زندگی میں اس برتر ہستی کا کوئی سراغ نہیں۔ ہم جیتے ہیں تو پیٹ کے لئے اور مرتے ہیں تو موت کی نہ چھوٹنے والی بیماری سے۔

(یوم آزادی)
۱۴ راگست

آج کا دن ہماری تاریخ میں یادگار ہے۔ اسی روز ہمیں ہندوؤں کی غلامی اور انگریزوں کی حاکمانہ عیاری سے نجات ملی تھی۔ مگر یہ دن مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ایک بڑا ہی عبرت ناک اور تاریک بھی کہا جا سکتا ہے۔

عبرت ناک اس لئے کہ پاکستانیوں نے کمزور اور اقلیت کے صوبوں کے رہنے والے چار کروڑ مسلمانوں کو بغیر ضمانت لئے ظالم اور تنگ نظر اکثریت کے حوالے کر کے بڑی بے پروائی سے ارضِ پاک میں متمکن ہو بیٹھے ہیں۔ اب یہ بے فکر ہیں۔

تاریک اس لئے کہ اتنی بڑی مسلم اقلیت کی قسمت اور ان کا وجود ہمیشہ کے لئے غیر متعین ہو گیا۔ آج وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مہاسبھائی ظلم و تشدد کے جوتوں کے نیچے دم توڑ رہے ہیں۔

مگر یہاں کے حاکمانِ وقت کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ اِدھر متوجہ ہوں۔ پھر متوجہ بھی ہوں تو لاحاصل۔ کیونکہ ان میں خود ہی تزلزل اور فقدانِ عمل ہے۔ حالانکہ یہ عزت جو انہیں حاصل ہے وہ ان معصوموں کی آبروریزی کا نتیجہ ہے۔ یہ ظاہری شوکت جس پر یہ نازاں ہیں انہیں کی ذلتوں کا یہ ثمرہ ہے۔ یہ دولت جس پر یہاں عزۃ ہے یہ انہی کی بربادیوں کا ماحصل ہے۔

آزادی کا دن پاکستان میں خدا خیر کرے ہمیشہ آئے۔ کاش ساتھ ساتھ وہ یاد سرفروشی جو اس کے حصول کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے پیش کیا تھا اُن کے قلب و جگر کو تڑپا سکے۔ آمین

نائیجیریا کی خانہ جنگی کا خاتمہ

عرصہ کے بعد یہ خوش خبری سننے میں آئی ہے کہ بالآخر نائیجیریا کی خانہ جنگی ختم ہوگئی۔ بائیفرہ یعنی وہ علاقہ جو فیڈرل حکومت نائیجیریا سے علیحدگی چاہتا تھا۔ بلکہ اس کے لئے بغاوت برپا کرکے مختلف ممالک سے امداد لے کر اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کے قائد اجو کو راہِ فرار اختیار کر چکے ہیں۔ ایبو قبیلہ جو زیادہ تر عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ وہ اس بناء پر نائیجیریا کا حصہ نہیں ہونا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت کا جزو نہیں بن سکتا۔

اس قبیلہ کی پشت پناہی بہت سی مغربی طاقتیں اندر ہی اندر کر رہی تھیں تاکہ افریقہ کی سب سے بڑی حکومت نائیجیریا متحد نہ رہ سکے۔ یہ بھی انتشار کا شکار ہو جائے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی جائے۔ اس طرح شہنشاہیت کے لئے اقتدار پیدا کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہاتھ آئے۔ مگر جنرل یعقوب گوں جو وفاقی نائیجیریا کے صدر ہیں۔ قابل صد ستائش ہیں جنہوں نے سر ابوبکر نفوا ابلو ما کے قتل کے بعد نہ صرف یہ کہ بحرانی کیفیت پر قابو حاصل کیا بلکہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے محفوظ رکھنے کی کوشش میں بے پناہ تدبر۔ دلیری اور دور اندیشی کا ثبوت دیا۔

خدا کرے اس ملک میں امن، سکون ہو۔ بھوک۔ عزبت۔ جہالت۔ فاقہ بیماری سے نجات ہو۔ خانہ جنگی سے ملک کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔

ہماری طرف سے نیک تمناؤں کا تحفہ سال نو کی تقریب میں بصد خلوص پیش خدمت ہے۔

خدا مدد کرے۔ آمین

۱۳ر جنوری ۱۹۶۹ء

چین اور ہندوستان

تبت کی اندرونی خود مختاری اور اس کی انفرادیت بزور ختم کرنے کے بعد اب چین ہندوستان کی طرف گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے علاقے شمال مشرقی سرحد کی ایجنسیوں میں جو آسام کا ایک علاقہ ہے۔ اور صدیوں سے ہندوستان کا حصّہ ہے۔ چین کی للچاتی ہوئی نگاہیں اِدھر مرکوز ہیں اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ علاقے میرے ہیں۔

نہرو کی کمزور اور Appeasing پالیسی نے جو دور اندیشی سے خالی تھی اس بات کی محرک ہوئی۔ نہ صرف یہ علاقے بلکہ سکم۔ بھوٹان Sikim — Bhutan بھی ہرگز چین کی چیرہ دستی سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ نسلی طور پر یہ ہندوستانی نہیں ہیں۔ طرزِ رہائش کے لحاظ سے یہ چین سے زیادہ قریب ہیں۔ مگر چین کے جزو نہیں ہیں۔ ان کی الگ حیثیت کو تسلیم کرنا چین اور ہندوستان دونوں کی دوستی کا راز اسی میں ہے کہ یہ اپنی جگہ قائم ہے لیکن کمزور وجود دو چکیوں کے بیچ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کو پس جانا ہے۔ اور پِس جانے کے بعد چکّی کے دونوں حصے اپنے کو معصوم سمجھتے ہیں۔ یہی حال ان علاقوں کا ہوگا۔ تبت ختم ہوا۔ اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا چین کہتا ہے میرا یہ ورثہ تھا۔ ہندوستان کہتا ہے میں نے متاعِ غیر کو حاصل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تبت کے چین میں ضم ہو جانے کو میں تسلیم نہیں کرتا۔

دلائی لامہ ہندوستان کی سرزمین میں ہیں۔ وہ سرزمین جہاں گوتم بدھ پیدا ہوا۔ وہیں پناہ گزین ہے۔ مگر بے یار و مددگار۔ ابھی پر بس نہیں اگر اس پر ختم

تھا تو ہندوستان خوش ہوتا۔ اب تو شیر نے خون کا مزہ چکھ لیا ہے۔ ہندوستان کی طاقت کا اندازہ معلوم ہوگیا ہے۔ قدم با قدم بڑھتے رہنے کا راز بھی چین کو معلوم ہوگیا ہے۔ ہندوستان اتنی بڑی طاقت کو ناخوش کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے چین کی من مانی باتوں کا پورا ہونا ضروری ہے۔ آج نہیں تو کل۔ ہندوستان امن کا خواہاں ہے۔ عدم تشدد کا مدعی ہے مگر امن چاہنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ بدامنی کو کچل دینے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ہی امن کا فرشتہ جنم لیتا ہے۔

ہندوستان کو کشمیر میں امن کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہاں بدامنی کو کچل دینے کی صلاحیت اس میں موجود ہے۔ مگر وہاں کے بے بس باشندے امن کے طالب ہیں۔ اُنہیں یہ نصیب نہیں۔

ہندوستان چین کی سرحدوں پر امن کا متلاشی ہے۔ عدم تشدد کا حربہ وہاں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ شاید یہ وہاں کارگر نہ ہو سکے۔

ہندوستان کی بقا اسی میں ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لے۔ چین کو دوٹک کہدے مقبوضہ علاقوں کا یہ نوک شمشیر لے لے۔ چین اس کا دوست ہوگا۔

یہ وقت تھا کہ ہندوستان۔ پاکستان دفاعی اعتبار سے ایک ہوتے۔

وصی مرحوم

"دوست کی موت پر"

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

۲۹ اگست ۱۹۵۹ء کی صبح بھی بڑی پر آشوب نکلی۔ رات بے چینی سے گزری صبح غیر معمولی طور پر جلدی اُٹھا۔ غسل خانہ میں بیٹھ کر نہانا چاہتا تھا کہ کسی نے آواز دی۔

بڑا بھائی (یوسف صاحب) نصو کے ساتھ اچانک نمودار ہوا شمیم سلمہ نے پکارا بھیا جلدی آئیے۔ وصی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یہ آواز اس وقت سے مسلسل میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اسی حال میں دوڑا۔ دل کی کیفیت آج تک غیر متوازن ہے۔ یہ خبر نہیں تھی۔ ایک تیر تھا جو سینے کے پار ہوگیا۔ اس کی شدت شاید وقت کم کردے۔ مگر اب اس کا زخم زندگی کے ساتھ ہے۔

۱۹۴۸ء میں تقسیم ہند کے بعد سلہٹ آیا۔ دیارِ غیر میں بود و باش اختیار کی۔ وصی ۱۹۵۰ء میں نمودار ہوئے۔ پٹنہ کی شناسائی نے قربت بخشی۔ افتد زمانہ نے قریب سے قریب تر کردیا۔ شیر و شکر ہوئے۔ راز و نیاز کی باتیں ہوئیں دوئی کا پردہ بالکل اٹھ گیا۔ اس کی کوئی ایسی بات نہیں جو مجھ سے پوشیدہ اور میرا کوئی راز نہیں جو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو۔ نہ اس میں اس کی آس ہونے

لگی۔ اور ہر ترا س کے عالم میں اس کے مخلصانہ مشوروں نے تازگی بخشی۔ کوئی مسئلہ ہو۔ اظہار کیا۔ سنا۔ روشنی ڈالی گئی اور سارے پہلو خصوصاً تاریک سے تاریک تر باریکیاں جن تک پہنچنے میں اس کو انتہائی ید طولیٰ حاصل تھا۔ آنکھوں کے سامنے چمکنے لگے۔

میں برابر کہتا تھا: "تم ہمیشہ تاریک راستہ دکھاتے ہو۔" مگر یہ حقیقت تھی جس کو سطحی طور پر دیکھنے والی نگاہیں خوش فہمی میں معاملے کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

موت برحق ہے مگر ایسی جواں مرگی قابلِ فہم ایسی بے وفائی کا میں قائل نہیں میں نے تو سمجھا تھا کہ اس بے وطنی میں تمہاری موجودگی طاقت بخشے گی میں نے تو سمجھا تھا کہ اس بے وطنی میں تمہاری تعلقات کاٹ دینے کے بعد تمہیں نعم البدل بنایا ہے۔ ہر آڑے وقت میں تمہاری رائے مشعلِ راہ ہوگی۔ اس قحط الرجال اور دوستوں کے فقدان کے زمانے میں خدا نے راز دار بھیجا ہے۔ دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے تمہاری مسکراہٹ کافی تھی۔ اہم سے اہم معاملات میں تمہاری تاریک بین نگاہیں ہمیشہ کام کرتی رہیں گی۔ دماغی عیاشیوں کے لئے تم سے بڑھ کر اور کون تھا سکونِ قلب وجگر کے لئے تمہارے فیصلے قطعی تھے۔ ہمت کے لئے تمہارے دست و بازو ہمیشہ متحرک رہیں گے۔ مگر تم نے شاید اتنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے گھٹنا ٹیک دیا۔ تاریک پہلوؤں کے دیکھنے کے عادی ہونے کے باوجود موت کو نہ پہچان سکے کیا اس سے بچنا ممکن نہ تھا۔ کیا اس سے گلو خلاصی کچھ دنوں کے لئے بھی ہو سکتی تھی۔ اگر ہوتی تو تم ضرور اس سے بچ نکلتے۔ مگر

خدا کا حکم ہے اور اس فرض شناسی نے تمہیں خاموش کر دیا۔ ؎

لازم ہے کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

میں بھی اب تنہا ہوں۔

فخرو بھائی مرحوم

ہر روز انسان کسی نہ کسی سے ملتا ہے۔ باتیں ہوتی ہیں۔ کسی سے ہمیں نفرت ہو جاتی ہے۔ کسی سے محبت اور کوئی بغیر نقش چھوڑے جدا ہو جاتا ہے۔ بہت سی ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کے اخلاقِ حمیدہ۔ خلوص۔ بے لوث جذبہ ہمدردی۔ غربا نوازی کنبہ پروری کی وجہ ایک ایسا گہرا۔ اَنمٹ اثر قلب پر منقوش ہو جاتا ہے۔ جو ساری زندگی آنکھوں کے سامنے چمکتا رہتا ہے اور ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ یہی حال ہمارے مرحوم فخرو بھائی کی زندگی کا ہے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا مرحوم کو خنداں و جولاں پایا۔ بچوں کے بہترین ناصح۔ جوانوں کے بہترین مشیر اور بوڑھوں کے صحیح ترجمان تھے۔ غریبوں کی پشت پناہی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

گاؤں میں پیدا ہوئے۔ شریف اور اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے فرزند ہونے کی وجہ سے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ پھر اخلاق بھی ایسا تھا کہ ہر کس و ناکس سے

محبت بھرے انداز میں ملتے۔ گاؤں کی زندگی ایک گتھی ہوئی سماجی بندھن کا نام تھا جب کوئی مصیبت سے دوچار ہوا پورا گاؤں اس کی پیٹھ پر ہوتا اور سب سے آگے فخرو بھائی ہوتے۔

ان کی پیدائش ۱۹۰۵ء میں فیروزی جو ضلع گیا میں ایک مشہور گاؤں تھا ہوئی ان کے بڑے بھائی نے ان کی تعلیم و تربیت اس خوبی سے انجام دلائی جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کی کرتا ہو۔ بچپن ہی میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے بڑے بھائی نے باپ کی حیثیت اختیار کرلی۔ ہر وہ چیز جو مقبولیت اور انسانیت کی طرف لیجانے والی ہو گھر کی زندگی میں تربیت سے فطرت ثانیہ بن گئی۔

انسانی زندگی کیا ہے۔ یہ ایک سربستہ راز ہے۔ بڑے بڑے حکماء نے اس کو سلجھانے کی کوشش کی مگر یہ مسئلہ آج تک حل نہ ہو سکا۔ بدھا نے اپنی سلطنت اسی اُدھیڑبن میں آکر چھوڑ دی۔ برسہا برس کی تلاش و جستجو کے بعد اس نے یہ بتایا کہ ساری خواہشوں کا محرک یہ جسم ہے۔ جو خود فانی اور سڑ گل کر خاک ہو جانے والا ہے۔ اس لئے نجات اسی میں ہے کہ اس جسم خاکی کو زیادہ سے زیادہ زیر کرتے رہو۔ کسی نے خدمت خلق کو فلاح و بہبودی کا راز بتایا۔ کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ۔ مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ آزاری قلب بڑا گناہ ہے۔ اس سے بچو۔

فخرو بھائی مرحوم نے اپنی زندگی ہمیشہ دل آزاری سے الگ رکھا۔ عزیزوں کی نگاہیں ان کو ڈھونڈھتی ہیں۔ ان کی موجودگی سکون کا باعث تھی۔

ہر مسئلہ جو بستی والوں کے سامنے ہوتا ان کے قلب سے قریب تر تھا۔ کسی کا جھگڑا چکانا ہو۔ ان کی ذات تھی جو ثالث بے چوں و چرا تسلیم کرلی جاتی۔ لڑکی کی شادی ہو وہ بغیر دعوت مدعو تھے۔ جب تک بارات واپس نہ چلی جائے ان کو چین نہیں تھا۔ براتیوں کی خوشنودی میں وہ اپنی شخصیت بھول جاتے۔ ایک پاؤں پر کھڑے رہتے۔ بچوں اور

نوجوانوں کو آئندہ کے لئے تیار کرتے۔ ہر اونچ نیچ سے وہ خبردار کرتے۔ بڑی بڑی شادیاں انہوں نے نہایت ہی حسن وخوبی سے انجام دیں۔ دونوں جانب کے لوگ خوش وخرّم ہوئے۔ مگر موت سے کون بچا ہے ؎

آں چناں زی کہ وقت مُردنِ تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

ہنگامہ

تقریروں، جلسوں، ہنگاموں کا ایک شور ہے جو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سنائی دے رہا ہے۔

مشرقی پاکستان کی فضا روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ صوبائیت لسانی ہنگامے اردو دانوں کے خلاف منافرت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر اس کو اسی طرح چھوڑ دیا گیا تو کوئی عجب نہیں کہ ملک کا شیرازہ بکھر کر وجود ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

پاکستان کی جنگ چند بنیادی اصولوں پر لڑی گئی تھی۔ اس ملک کے حصول کے لئے بدقسمتی سے برصغیر کے اقلیتی صوبے کے مسلمانوں نے اپنی قدیمی روایت کی بناء پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ برصغیر میں جو تحریک بھی مسلمانوں کی بقاء کے لئے چلائی گئی اس میں یہی ہندوستانی اقلیتی صوبوں کے مسلمان تھے جو پیش پیش رہے۔ مغلوں کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم کو سہارا دینے کے لئے ہندوستانی ہی مسلمان نے احمد شاہ ابدالی کو مدعو کیا۔ سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد اسی اقلیتی ہندوستانی مسلمان کی مرہونِ منت رہی۔ مجاہد تحریک کی قیادت اسی مسلمان نے کی۔

تحریکِ دیوبند۔ تحریکِ علی گڑھ۔ تحریکِ پاکستان۔ کونسی ایسی تحریک ہے جو برصغیر کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی اولوالعزمیوں کی دسترس سے بالاتر ہو۔ تحریکِ پاکستان جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہ انہی مسلمانوں کے خون کی لائی ہے۔

ہندوستانی مسلمان اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں سے مِن کل الوجوہ آگے تھے۔ تعلیم ملازمت۔ دولت۔ عزت میں یہ کسی طرح ہندوؤں سے کم نہیں تھے۔ ان کو پیٹ کے ظلم نے اتنی بڑی قربانی پر ہرگز نہیں اکسایا۔ کیونکہ ان کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ بلکہ ان کے

سامنے اس سے بھی بڑا نصب العین مذہب۔ ثقافت۔ زبان تھا۔ اسی نے برصغیر کے سارے مسلمانوں کو متحد کیا۔ اتحاد نے ایک جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کی مدت گرچہ مختصر ہے۔ مگر اسی دور میں بڑی تند و تیز ہوائیں چلیں۔ طوفان آئے۔ قتل وخوں ریزی ہوئی۔ تب کہیں جا کر یہ ملک پاکستان وجود میں آیا۔ اب پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بدقسمتی سے قائد اعظم۔ قائد ملت اس سرعت سے عدم کی طرف چلتے بنے گویا وہ ۱۴ اگست ۴۷ء ہی کے منتظر تھے۔ پھر لوٹ کا دور چلا۔ چلتا رہا۔ چل رہا ہے بائیس سال تک ملک کے نظم ونسق کی قیادت کم وبیش مغربی پاکستان کے ہاتھوں میں رہی۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو اس کے مستحق نہیں تھے۔ مگر حادثہ کے طور پر یہ حکومت پر قابض رہے انہوں نے ایک طرف تو نظریہ پاکستان کا جنازہ نکالا۔ دوسری طرف ان لوگوں کو بھی منظم طور پر برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھا جو صرف پاکستان ہی کے لئے سب کچھ لٹا کر مہاجر بن کر آئے تھے۔ کیونکہ نظریہ پاکستان نہیں مٹ سکتا۔ جب تک کہ یہ خانماں برباد لوگوں کے مٹنے کے احساس کو بھی نہ مٹا دیا جائے۔ چنانچہ ان پر آوازے شروع ہو گئے۔ یہ بھی کہا گیا

They are Traitoss to India Smuggless in Pakistan,

۱۹۵۶ء کے آئین میں دو زبان کی شق اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ پاکستان کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کی بربادی کا مذاق اڑانا ہے۔ اصول پر بھی بڑی دیدہ دلیری سے سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ گویا حصول پاکستان اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کا حق تھا۔ اب ملازمتیں۔ تجارت۔ حکومت سب کے مستحق صرف وہ ہیں۔ جو اتفاقی طور پر ۱۹۴۷ء سے پہلے یہاں پیدا ہوئے تھے۔

یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اکثریت میں ہونا یہ کبھی حق خود ارادیت یا پاکستان کے قیام کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مرشد آباد۔ مالدہ بنگال کے دوسرے حصے آسام

کے علاقہ۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ پاکستان کے جزو نہیں ہیں۔ نہ پاکستان میں شامل ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کا حصول۔ منظم جدوجہد۔ قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ اس میں برصغیر کے سارے مسلمانوں کی پرخلوص کوششوں۔ بے لوث خدمات۔ بے پناہ جانی و مالی پائمالیوں کے بعد یہ ممکن ہو سکا ہے۔

اس لئے۔ کوئی آئین۔ کوئی تبدیلی۔ کوئی ترمیم جس سے برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات۔ امیدوں اور عزائم کی توہین ہوتی ہو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی ہے۔

ابھی ساری قوم کس مپرسی کے عالم میں صرف لیڈروں کی تقریروں پر نوحہ کناں معلوم ہوتی ہے۔ کسی کے چھ نکات ہیں۔ کسی کے گیارہ۔ کسی کی تقریروں کا لب لباب صرف مغربی پاکستان کی ترقی پر آٹھوں آنسو بہانا ہے۔ کوئی لگانِ اراضی معاف کر دے گا کوئی سارے کاروباری اداروں کو قومیا لے گا۔ ساری غربت کا مداوا بس یہی سمجھا جا رہا ہے۔

مسلمان قوم کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ جب خدا کا نام لے کر نکلی ہے تو دنیا اس کے قدموں کے نیچے آئی ہے۔ جب اس نے دنیا سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہ سب کو کھو بیٹھے ہیں۔

ہمارا نعرہ اس وقت یہ ہونا چاہیئے کہ قوم پر مصیبت کا وقت آن پڑا ہے۔ اس کے نظریات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ مغلوں کے زوال کے بعد سے دو سو سالہ جدوجہد کا خلاصہ پاکستان کا قیام ہے۔ جو دشمنوں کے نرغہ میں ہے۔ عظیم چرچل کی زبان میں قوم سے "آنسو۔ مصیبت اور خون کا تحفہ مانگنا چاہیئے"۔ مزید قربانیوں کے لئے ڈٹ جانے کی تلقین ہونی چاہیئے۔ کوئی جماعت بھی برسرِ اقتدار آگئی تو اس سے ٹیکسوں کی زیادتی۔ تعینات کی کمی اور لگان میں اضافہ کی امید رکھو۔

ہاں یہ ترقیاتی امور پر خرچ ہوں گے۔ پھر ایک خوش حال معاشرہ کی تعمیر ہو گی۔

رشوت اقربا پروری کا قلع قمع کر دیا جائے گا۔ عدل و انصاف کو پہنچنے کا موقع ملے گا۔ ووٹ آئے یا نہ آئے مگر ایمانداری۔ دیانتداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اصول کی قربانی کسی صورت میں نہیں ہونی چاہیئے۔

فرض کر لیا جائے کہ اس سے ووٹ حاصل نہیں ہو سکتے۔ مگر ووٹ حاصل کرنا مقصد ہے۔ یا صحیح بات صحیح طور پر صحیح جگہ پہنچا دینا یہ فرض کی ادائیگی۔ قوم کی خدمت۔ ملک و ملت کی ذمہ داری ہے۔ میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ ایسے کہنے والوں کو شکستِ فاش ہو بھی جائے تو کیا ہوا۔؟

کچھ لوگ کہیں گے کہ پاکستان ختم ہو جائے گا۔ فرض کر لیا جائے کہ خدانخواستہ پاکستان ختم بھی ہو گیا تو کیا ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک پاکستان نہیں تھا تو کیا اسلام نہیں تھا۔ اسلام تھا اسلام رہے گا۔ ہم غلط مسلمان اگر نہ رہیں تو اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ساری مصیبت ہمارا غلط اندازِ فکر ہے۔ اگر غلط چیز مٹ جائے۔ مٹ جانے دو۔ مگر اصول پر سمجھوتہ کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ڈھال کی طرح تندرست و توانا باقی رہنا ہے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کی ہر وہ یقین دہانیوں کے ساتھ رہنا ہے جو برصغیر کے مسلمانوں سے کئے گئے تھے ورنہ نوشتۂ دیوار سے کوئی مفر نہیں۔

اگر بنگال الگ ہو جائے تو کیا ہو گا

حاکمانِ مغربی پاکستان اس بات سے بڑے خائف نظر آتے ہیں کہ مشرقی بنگال میں جو اگریسیو (Aggressive) بنگالیت کی تحریک چل رہی ہے اس سے انتشار پیدا ہو گا اور ملک دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ جغرافیائی طور پر ملک دو حصوں میں تو تقسیم شدہ ہے ہی۔ یہ کیفیت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ملک کی پیدائش کے بعد رہی رضامندی سے تسلیم شدہ ہے۔

مگر جب تک دماغی اتحاد مضبوط رہا نہ جدائی کا خوف تھا نہ نظریہ کے خلاف کہیں سے آواز پیدا ہوئی۔ نہ اس آواز کو سننے کے کوئی تیار تھا۔ اندازِ زمانہ کہیئے۔ یا غیر جمہوری طرزِ حکومت خیال فرمائیے یا حادثات کے اتار چڑھاؤ نے جغرافیائی جدائی کو اب دماغی جدائی سے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔

کھلے بند مشرق۔ مغرب کے گناہوں کو گنوا رہا ہے اور اس میں شدت بار بار اعادہ نے پیدا کر دی ہے۔ اخباروں میں۔ ریڈیو پر ہر ممکن طریقے سے تنفّر کی زہریلی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔

بدقسمتی سے ذمہ دار حضرات جن کا تعلّق مغرب سے ہے وہ اپنے کو گنہگار سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ میرے خیال میں گناہ ہی نہیں ہے جو تسلیم کر لیا جائے یا دوسروں کے گناہ کو اپنے سر کیوں لے لیا جائے۔

مشرق والے روز کہتے پھرتے ہیں کہ اس علاقہ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ مغرب بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے۔ مشرق کو لوٹا گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

میں اعداد و شمار سے بحث نہیں کروں گا بلکہ موٹی عام فہم سیدھی بات کہہ دینا چاہتا ہوں۔ مغرب ہو یا مشرق جو سرمایہ دار یا صنعت کار ہیں وہ کیا پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں یا بنگال سے یا ہندوستان سے آئے ہوئے یا بلائے ہوئے تجربہ کار۔ پختہ کار کاروباری لوگ ہیں۔

یہ بالکل واضح ہے کہ مغرب میں اور مشرق میں کم و بیش جتنی قابلِ ذکر صنعتیں ہیں وہ سب ان ہی پختہ کار ہندوستانی مسلمانوں کی ہیں۔ یہ ہندوستانی مسلمان کیا بہار یو۔پی۔ سی۔پی۔ کے ہیں یا اس خاص علاقہ کے۔ جن کا پس منظر۔ ماحول۔ سمجھ بوجھ۔ سب کاروبار ہی کاروبار رہا ہو۔ میری مراد ایک خاص طبقہ کے مسلمانوں سے ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تجارت بھی بڑا پیچیدہ موضوع ہے۔ اس کو سیکھنا کرنا۔ اس سے فائدہ اٹھانا کوئی بچوں

کھیل نہیں ہے۔ یہ سیاسی پرمٹ نہیں ہے یا اس بھروسہ پر کاروباری تجارت نہیں کرتے۔ ساری تجارت اسی خاص طبقہ سے وابستہ ہے۔ اس ملک کو ترقی دینے میں ان کا بڑا دخل ہے۔ اگر یہ نہیں آتے تو پاکستان کبھی اتنی جلد ہندوستان سے بہت سی صنعتوں میں سبقت نہیں لے جاتا۔ ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیئے۔ اس طبقہ کے اکثر لوگ اپنے علاقے سے پاکستان کے قریب تر علاقوں میں چلے آئے۔ یہ ایک قدرتی امر تھا۔ ظاہر ہے جہاں آئے وہاں کی آب وہوا سے وہ واقف تھے۔ کاروباری نشیب وفراز سے بھی پوری طرح باخبر تھے ملک کو ضرورت تھی۔ حکومت کی ہمت افزائی بھی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی رہی۔ خاص علاقہ جلد از جلد ترقی کی شاہراہ پر پابجولاں ہوگیا۔

اس میں شکایت کیوں۔ زور سے کسی کو تجارت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ زور سے تجارت کے نکات حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ زور سے کوئی ملک یا قوم ترقی نہیں کر سکتی یہ ایک قدرتی عمل ہے جو تدریجی طور پر کام کرتا رہتا ہے۔

پاکستان کی ابتدا صفر سے ہوئی ہے اس وقت نہ پلیننگ کمیشن تھا نہ کوئی احتیاط سے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کوئی شخص عمل پیرا ہوا۔ ہر جگہ خلا ہی خلا تھا۔ اس کو بھرنا تھا جس کی سمجھ میں جو آیا ضرورت کے تقاضوں کے ماتحت وہ اس میں لگ گیا۔ کچھ گرے۔ سنبھلے پھر اٹھے کچھ اس قدرتی عمل سے گزر چکے تھے وہ کامیاب ہوئے۔ نئے ملک میں۔ غیر ترقی یافتہ ملک میں۔ ترقی کی جدوجہد میں ارتکاز زر ہو ہی جاتا ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ارتکاز زر کی ہمت افزائی بھی حکومت ہی نے کی۔ ہندوستان سے آنے والا انکم ٹیکس کے گوشواروں میں جو اعلان کرتا گیا حکومت اس کو تسلیم کرتی گئی۔ جب کہیں جاکر کچھ سرمایہ دار وجود میں آئے۔ ورنہ یہاں سرمایہ دار ہی کہاں تھے۔ ایک خاندان بھی ایسا نہیں تھا جو موجودہ بائیس خاندانوں میں شامل کیا جاتا۔ •

پھر ۱۹۵۸ء کے انقلاب میں حکومت نے چھپی ہوئی دولت کا حساب مانگا تاکہ

خزانہ بھرے اور ناجائز طور پر جمع شدہ دولت کو خاص شرح سے ادائیگیٔ انکم ٹیکس کے بعد جائز قرار دیا جا سکے ۔ یہ بھی ہوا ۔ اب اس دولت کے صحیح استعمال کا موقع ۶۵ء کی جنگ نے پیش کیا ۔ جہاں دولت مندوں نے حکومت کے معمولی اشارہ پر امید سے زیادہ پیش کیا جس کا اظہار اور اقرار حکومت نے ۶۶ء کے بجٹ میں مزید ٹیکس نہ لگا کر کیا ۔ یہ حقائق ہیں اس سے انکار کرنا ظلم ہوگا ۔

اس لئے مشرق کی شکایت مغرب کے خلاف سوائے منفی پہلو کے اور کچھ نہیں ہے ۔

البتہ یہ شکایت حق بجانب ہوگی کہ ان سرمایہ داروں نے اپنے تحفظ کی خاطر ہر اس سیاست داں کی ہتھیلی بھر دی جس سے انہوں نے خطرہ محسوس کیا ۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ داروں نے ضمیر فروشی کر کے اپنی مرضی کے خلاف روپے دیئے ۔ یا سیاست دانوں نے انصاف کے اصول کو بالائے طاق رکھ کر ہر ناجائز طور سے روپے بٹورنے میں ایک دوسرے کو پیچھے کر دیا ۔

اب اگر سیاست دانوں کی بات ہو تو سیاست دان کون ہیں ۔ ان کا تعین ہونا چاہیئے ۱۹۴۷ء سے آج تک برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست جذباتی رہی ہے ۔ کبھی ہم نے اسلام کے نام پر ووٹ حاصل کیا ۔ کبھی متحدہ محاذ کی شکل میں علاقائیت کے حق میں ووٹ ڈالے اور کبھی بنگلہ دیش کا نعرہ لگا کر ہم سیاست کا جنازہ نکال رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ جو نظر آتا ہے وہ مسلمانوں کی ناپختہ کاری ۔ مردِ کارواں کا فقدان ۔ منزل سے بے خبری ۔ پھر قدرتی موت ہے ۔

احترامِ قانون

زندہ قومیں قانون کا احترام کرتی ہیں۔ ان کی عدالتیں انصاف کا مرکز ہوتی ہیں۔ مجرم کی سزا قانون کی سربلندی کی عکاس ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

سنیٹر ایڈورڈ کینیڈی Sanator Edward K اپنی کار سے سابق صدر کینیڈی کی سکریٹری کے ساتھ جا رہے تھے۔ راستہ میں کار ایک پل سے ٹکرا گئی اور گاڑی پانی میں گر گئی۔ ان کی ہمسفر اٹھائیس سالہ "میری کو بچن" پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گئیں۔ ایڈورڈ کینیڈی نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر کوشش کی کہ وہ زندہ نکل آئیں۔ مگر وہ مر چکی تھیں۔ قدرتی طور پر ان کے دماغ پر اس حادثہ کا برا اثر ہوا ہوگا۔ انہوں نے اس حادثہ کی خبر پولیس کو نو گھنٹوں کے بعد کی اور عذر یہی پیش کیا کہ حادثہ نے ان کے حواس اڑا دیئے تھے۔

مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ وہ ملزم ٹھہرائے گئے۔ ان کی گزشتہ نیک مصلحتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے عدالت نے دو ماہ کی سزا سنا دی۔ مگر سزا کو تعطل میں رکھ دیا یعنی سزا اپنی جگہ پر رہی۔ مگر ان کو بھگتنا نہیں پڑا۔

اب سنئے سنیٹر ایڈورڈ کینیڈی نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اپنی بریّت اقبالِ جرم میں سمجھا۔ پھر یہی نہیں بلکہ اپنے حلقۂ انتخاب میں جا کر اعلان کیا کہ اگر ہم نے آپ کا اعتماد کھو دیا ہے تو سنیٹر شپ Sanator Ship سے استعفا دینے کو تیار رہوں۔

اب ہمارے ملک کا موازنہ فرمائیں جس کا نام ہے "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کہاں کی عدالت اور کہاں کا انصاف۔

ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ سنیٹر کنیڈی کا ۱۹؍جولائی کو مس میری جو کوبچن کے ساتھ تنہائی میں شراب کی بدمستیوں کے ساتھ کار میں جانا۔ پھر ایک ایسی محفلِ رقص وسرود میں ان کی سیاسی کارکن لڑکیوں کی شرکت۔ شوروغوغا جس سے آس پاس کے لوگ نالاں۔ ان کی نیندیں برباد۔ یہ کہاں کی انسانیت یا شرافت ہے۔ ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد مس میری کو ان کی اس قیام گاہ پر پہنچانے کے لئے روانگی اور درمیان راہ ہی یہ حادثہ۔ یہ ساری باتیں بتا رہی ہیں کہ امریکی معاشرہ کتنا گندہ ہو چکا ہے۔ عریانی۔ فحاشی بے راہ روی اس منزل پر آکر سسک رہی ہے۔ جہاں سے پلٹنا تو مشکل ہے البتہ ڈوبنا آسان ہے۔ یہ تہذیب اب اپنے ساتھ پوری آبادی کو لے کر غرق ہونے والی ہے تاکہ اس سرزمین پر ایک ایسی نسل آنکھیں کھولے جو ان ملوثات سے پاک ہو۔ کیا ایٹم کی زد سے امریکہ بچ سکتا ہے۔ نہیں یہ تو خودکشی پر آمادہ ہے۔

یہی جنس کا بھوت ہی مذاقِ جورِ گلچیں پر رنگ و بو کی آمیزش سے فتنۂ محشر بپا کرنے میں پیش قدمی نہ کرادے۔

قسیم

۲۶؍جولائی ۱۹۶۹ء

سیاست بنگال

۱۹۷۱ء میں بنگال کے اندر جو قیامت آئی۔ وہ خلاف توقع نہ تھی ۱۹۶۸ء سے بے لگام سیاست۔ علاقائی عصبیت۔ نفرت آگئیں نعرے۔ اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ طوفان آنیوالا ہے۔ اور اسکی رفتار نہایت تیز و تند ہو گی کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان غلط ہو گیا کچھ یہ کہتے تھے کہ پاکستان اگر نہیں رہا تو اسلام خطرے میں ہو گا میرا جواب یہی تھا کہ دونوں نظریے تباہ کن ہیں۔

۱۹۴۷ء پاکستان موجود ہے۔ مگر نظریہ پاکستان مفقود و کالعدم ہے ایسے پاکستان سے خطرہ ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے پاکستان نہیں تھا۔ مگر اسلام تھا ؎

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو ضرورت نہیں پیمانے کی

یہ ضرور اندیشہ ہے کہ مسلمان نام کی کوئی قوم اس برصغیر میں باعزت

طور پر خدانخواستہ پاکستان کی بربادی کے بعد باقی نہ رہ سکیگی۔ اس میں ہمارا ہی قصور ہے۔ ہمیں قدرت نے موقع دیا۔ افسوس ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔

سنہ ۱۹۷۱ء کی بنگالی قومیت کی جارحانہ تحریک نے میرا خیال صحیح ثابت کر دیا

ہزار مصیبتوں کے بعد خاک و خون سے گذر کر پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔ ہندوؤں نے سر توڑ کوشش کی مگر یہ مسلمانان برصغیر کے عزائم آئینہ دار بن کر ابھر آیا۔ جس دن سے یہ وجود میں آیا۔ اسی دن سے ماضی کی تلخیاں۔ تاریک مستقبل کی پیشین گوئیاں۔ مالی مشکلات۔ سیاسی عدم استحکام اور پھر حرف غلط کی طرح فنا کے بعد اس کا ہندوستان میں ادغام برملا کہا جانے لگا۔

قائداعظمؒ کا وہ الہامی جملہ پاکستان باقی رہنے کیلئے وجود میں آیا ہے" ہمیشہ مشعل راہ رہا۔

یوم ولادت ہی سے پاکستان کو کشمیر میں الجھا دیا گیا۔ اب یہ مغربی پاکستان کا مسئلہ بن کر رہ گیا۔

مشرق میں کون کون سے اژدھے ہیں جس کی طرف بنگال والوں نے سوچنے کی تکلیف گوارا فرمائی اور نہ حکومت پاکستان نے توجہ دی۔ نہ یہاں کے رہنماؤں کو اس بات کی فرصت ملی کہ تقسیم سے پیدا شدہ مسائل کس طرح پیچیدگیاں پیدا کر سکتے ہیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک مسلمانان برصغیر کی سیاست کا انداز یا تو منفی رہا یا دفاعی۔ ابتدا میں فرنگی حاکموں سے عدم تعاون رہا جو زوال حکومت کے بعد فطری امر تھا۔ پھر سر سید احمد خاں غدر کے داغ مٹانے کی کوشش کے

بعد تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے مسلمان من حیث قوم شکست خوردہ۔ ذلیل وخوار غیر منظم پھرتے رہے۔

۱۹۴۰ء میں پہلی بار سیاست نے کروٹ لی اور مسلمانوں نے دفاعی سیاست کو خیرباد کہہ کر مطالبہ پاکستان کا جارحانہ اقدام کیا۔ ساری قوم متحد اور ایک زبان ہو کر اس کے حصول میں لگ گئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر دو حصوں میں بٹ گیا اور پاکستان نقشہ دنیا وجود میں آ گیا۔

اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک تعطل رہا اور ۱۹۷۱ء تک پاکستان کی پالیسی یا تو منفی رہی یا دفاعی۔ ہندوستان نے ان ایام میں ہمیشہ جارحیت کا بھرپور ثبوت دیا۔ کشمیر پر قبضہ۔ حیدر آباد پر پولیس ایکشن۔ گوا پر فوج کشی پاکستان پر ۱۹۶۵ء میں بغیر اعلان جنگ اور آج "بنگلہ دیش" کے نام پر ہزاروں فتنوں کا طوفان۔

یہ نہیں کہ پاکستان کو ایسے مواقع نہیں ملے۔ ضرور ملے۔ مگر لیت ولعل غیر یقینی کیفیت۔ نظریہ پاکستان کے انحراف سے تنزل۔ چند ملازمتوں پر مرکز کی تقسیم پر جنگ وجدل پیریٹی Parity زبان و ہر موضوع پر ملک میں انتشار رہا مگر ہم وقت پر پیچھے ہٹ گئے۔ مثلاً

۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری۔ کشمیر میں بغاوت۔ یہ بہترین موقع تھا کہ ہم اقدام کرتے اور وادی کشمیر میں کشمیریوں کے قتل عام روکنے کیلئے دخل دینے کی کوشش کرتے۔

آئے دن ہندوستان پر فرقہ وارانہ جنون طاری رہتا ہے۔ تقسیم سے آج تک کون صوبہ ایسا ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ فساد نہ ہوا ہو۔ راول قلعہ۔ جمشید پور جبل پور۔ احمد آباد۔ رانچی۔ کلکتہ۔ کریم گنج۔ علیگڈھ، لکھنؤ میں لاکھوں مسلمان

قتل کر دیے گئے اور لاکھوں۔ پاکستان چوری چھپے آنے میں کامیاب بھی ہوئے مگر ملک میں داخلہ کی غیر ہمدردانہ پابندیوں سے نہ بچ سکے۔ ہم نے نہ کوئی کیمپ کھولا نہ دنیا کی رائے عامہ کو جھنجھوڑا۔ نہ امداد کی اور نہ ریڈ کراس سے اپیل کی آنے والے زیادہ تر بنگال ہی آئے جہاں آنے میں کچھ آسانیاں تھیں۔

اب بنگال کا حال ملاحظہ ہو پچپن (۵۵ ہزار) ہزار مربع میل کی مختصر سی سرزمین پر پہلے ہی آبادی کا بار عظیم تھا۔ یہ نئے آنیوالے مقامی آبادی کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے۔

پہلے آنیوالوں میں وہ مخلصین تھے جو آپشن option دے کر آئے گویا وہ مہمان تھے اور مدعو کئے ہوئے تھے۔ دوسرے دولتمند جن کو انکم ٹیکس کی چھوٹ دے کر بلایا گیا۔ تیسرے ان کے دالبستگان۔ چوتھے پناہ گیر۔ سب مہاجر تھے۔ ملک کی ترقی ان کی مرہونِ منت ہے۔ مگر تنگدل سیاست والوں نے نفرت کی مہم ان کے خلاف چلائی اور حکومت بھی اس غلط نفرت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

sons of soil (فرزند زمین) کا شرمناک نعرہ حکومت کے اندر اور حکومت سے باہر شروع ہوا۔ بدقسمتی سے دور ایوبی کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے اسی دلدل پر بنگالی قومیت۔ اردو کے خلاف نفرت۔ اردو بولنے والوں پر مظالم۔ ان کا ہر شعبۂ زندگی سے اخراج یقیناً نظریۂ پاکستان سے انحراف تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی توہین تھی۔ مسلم قومیت کی نعش کو روندنا ان چیزوں کی موجودگی میں بربادی کے سوا اور کس چیز کی توقع ہو سکتی تھی ۱۹۷۱ء میں بنگالی قومیت کا نعرہ عذاب الٰہی کی شکل میں ہم پر ٹوٹ پڑا اور ہماری کوئی چیز محفوظ نہ رہ سکی۔

ایوب خان کے دور میں بظاہر ترقی کی رفتار تیز ہو گئی۔ مگر سیاست گردی کی رفتار اس سے بھی تیز تر تھی۔ بنیادی جمہوریت کچھ ترمیموں کے ساتھ مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ مگر سیاسی تدبر کے فقدان نے جناب ایوب خان کو رخت سفر باندھ کر چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ بھی ایک سانحہ عظیم ہے۔

مارشل لا آیا — مگر جو مظالم ان کے آخری دور حکومت میں ہوئے تھے. ان کو "معاف کر دو اور بھول جاؤ" کے اصول پر ملزموں کو قرار واقعی سزا دیئے بغیر معاف کر دیا گیا۔ یہ حق العباد کی توہین تھی۔ اس لئے عذاب خداوندی کا آنا ضروری تھا۔ جو سنہ ۱۹۷۱ء میں آیا۔

ان تجربات کی روشنی میں اب ملک کا نقشہ۔ لوگوں کے سوچنے کے طریقے حکام اور پالیسی بنانے والوں کے نقطۂ نظر میں صحیح تبدیلی پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ورنہ اس سے بھی شدید بربادی و تباہی کا سامنا ہو سکتا ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ بنگال کے لوگوں کے دماغ کو لہلہاتی ہوئی آسام کی وادیوں کی طرف پھیر دیا جائے۔ ان کا مطمح نظر تریپورہ کا حصول۔ آسام کے بغیر پاکستان میں کمی کی شدت کا احساس پیدا کرنا چاہیئے۔ یہ مطالبہ وہاں کی بے بس مسلم آبادی مظلوم بہادر رہنا گا۔ میزو قبائل کے تحفظ کی بنا پر ہمارے لئے ازبس ضروری ہے اس میں جان ڈالنا اور اس کے حصول کے لئے ہمہ تن کوشش کرنا ہماری آئندہ سیاست کا مقصود و منتہی ہونا چاہیئے۔

اقلیت کے ساتھ پاکستان کا سلوک ہمیشہ اچھا رہا ہے. مگر افسوس ہے کہ اقلیت کیساتھ ہماری رواداری کے باوجود تقسیم ہند کے پہلے کی سطح سے اپنے کو بلند دکھانے میں بخل سے کام لیا ہے. بلکہ ہر وہ اقدام جس سے ملک کو نقصان پہنچے اس مقصد کیلئے وہ ہندوستان سے فیض لیتے رہے۔ اس کا انجام اراکین سلطنت دیکھ چکے

ہیں۔ لہٰذا آئندہ محتاط راہوں پر گامزن ہونے کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کی صحتمندانہ طور پر بقا کا راز اس میں مضمر ہے کہ اقلیت مطمئن رہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے احتجاج کر سکے۔ خاموش دبی ہوئی یا دبائی ہوئی اقلیت ناسازگار حالات میں ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اقلیت چاہے مذہب کی بنا پر۔ یا زبان کی بنا پر یا خیالات کی بنا پر ہو اس کے ساتھ رواداری کا برتاؤ ہونا ضروری ہے۔ وہ اقلیت جو اکثریت کے فنا کی درپے ہو خود مٹ جاتی ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے بنیادی چیزوں کو حل کرنے کی کبھی خلوص دل سے کوشش نہیں کی۔ تعلیم سے ہماری دلچسپی نہ رہی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ساری نوزائیدہ نسل (جو سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوئی) نظریہ پاکستان سے منحرف نظر آنے لگی۔

زبان کا مسئلہ ہم مصلحت کی بنا پر حل نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ حل کردہ ہے جس کا انجام بنگالی قومیت خوفناک صورت میں ہم دیکھ رہے ہیں۔

دستور تو بن بن کر کالعدم ہوتے رہے۔

کشمیر اب مغربی پاکستان تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مشرقی پاکستان کی بے پناہ آبادی کے سامنے آسام یا تو اس کا جزو ہو جائے یا یہ آسام ہی کو ڈبو دے۔ دونوں حالات میں اس خطہ کے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ آسام میں یوں بھی بہاو رنا گا۔ میزو۔ کھاسیا قبائل ہندوستان کے لئے دردسر ہیں۔ اور بغاوت پر آمادہ مگر ہماری بے حسی یا ناعاقبت اندیشی نے کبھی ان سنہرے مواقع سے مستفیض ہونے کا فائدہ نہ اٹھایا۔

اسی کے ردعمل نے بنگالی قومیت کے پھنکارتے ناگ کو جنم دیا جو آج

ہم اسی سے ڈسے جا رہے ہیں۔

یہاں کے مسائل سمجھنے کے لئے اور مغربی بنگال۔ آسام کی سنسنی خیز جذباتی سیاست کو حالات کی نزاکت کے ماتحت جاننے کے لئے صدرِ مملکت کے نائب کا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں ہونا ضروری ہے جس کا کام اس علاقے کی بہبودی ہو۔ تاکہ ہندوستان بھی ہماری طرح علیحدگی پسندی کی تلخ کامیوں کا گھونٹ پینے کا مزہ چکھ سکے۔

ہندوستان بہت بڑا ہے۔ اس کو چھوٹا ہونے کی ضرورت ہے تاکہ مصائب سے نجات مل سکے۔

تمت